

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224920

UNIVERSAL
LIBRARY

معاهده ہند

و

برطانیہ

ہندستان کے مستقبل پر ایک نظر

سر سید سلطان احمد

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اگست

طبع اول

درب

قیمت

سول اینٹس

نگارستان انجمنی اردو بازار دلی

ادارہ ہندستانی پبلشرز دلی نے جید برقی پریس ٹی سو چھپوا کر شائع کیا

دیکھیے

ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کو آئینوالے زمانے میں ایک عہد نامے کے تحت لانے کی تجویز سب سے پہلے سرکاری طور پر اس دستاویز میں کی گئی تھی جسے "کریس کی تجویز" کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ انگریزی سرکار اور اس دستور بنانے والی جماعت کے درمیان جو ہندوستان میں قائم کی جائے گی ایک عہد نامہ ہوگا جس میں "ان تمام سوالوں کی چھان بین کی جائے گی جو انگریزوں کے ہاتھوں سے نکال کر پوری پوری ذمہ داری ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دینے کی وجہ سے پیدا ہوئے گی۔" ہندوستان کی دستوری ترقی کے لئے جن قاعدوں پر سوچ بچار کیا جاتا رہا ہے۔ ان میں اس نئی تجویز نے ایک باطل انوکھی صورت پیدا کر دی ہے۔ عام طور پر جب کبھی کسی انگریزی نوآبادی کو سیاسی ترقی دے کر سوراہی حیثیت دی جاتی ہے تو انگریزی پارلیمنٹ اس مطلب کے لئے مختلف وقتوں میں دستوری اصلاحوں کے قانون بناتی ہے مثلاً اگر ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دینا ہو تو دستوری حیثیت سے جو کچھ ضروری ہوگا وہ صرف یہ کہ انگریزی پارلیمنٹ یہ قانون بنا دے گی کہ ہندوستان کے بارے میں آئندہ بادشاہ سلامت کو مشورہ دینے والے ہندوستانی وزیر ہوں گے۔ جو ایک ہندوستانی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اس تبدیلی کے لئے کسی عہد نامے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بارے میں جو نیا قاعدہ تجویز کیا گیا ہے۔ اس کی

وجہیں یہ ہیں:-

(الف) اعلان کا جو مسودہ سر اسٹے فورڈ کریس لائے تھے۔ اس میں یہی باتوں کا

بھی ذکر تھا۔ اور یہ لکھا تھا کہ انھیں بھی دستور بنانے والی جماعت میں اپنے "نمائندے مقرر کرنے" کی دعوت دی جائے گی، اور برطانوی ہندوستان کے صوبوں کی طرح انہیں بھی اس کا اختیار ہوگا کہ وہ چاہے نئے دستور پر قائم رہیں یا ان میں سے ہر ایک اپنی الگ الگ حیثیت قائم رکھے۔ ان میں سے ہر صورت میں ان کے عہد نامے میں پارٹیوں — انگریزی سرکار — برطانوی ہندوستان اور خود دیسی ریاستوں — کی آپس کی بات چیت سے طے ہونا تھے :

(ب) اب تک صرف انگریزی سلطنت کے انہی ملکوں کو ڈومنین کا درجہ حاصل تھا جن کی آبادی زیادہ تر یورپی نسل کی ہے، ہندوستان، اگر وہ برطانوی کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کے اندر رہے، تو پہلی بڑی ایشیائی ریاست ہوگا جو اپنی مرضی سے ان آزاد قوموں کے گھر مٹ میں شامل ہو جائے گا جنہیں برطانوی کامن ویلتھ کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے خاص حالات کو دیکھتے ہوئے خاص قاعدے قانون کی ضرورت ہوگی :

(ج) اعلان کے مسودے میں اس صورت کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ شاید ہندوستان یونانی ڈکٹنگ ڈم کے ساتھ عہد نامے کی رو سے گہرے تعلقات رکھتے ہوئے بھی برطانوی کامن ویلتھ سے علیحدہ ہو جائے :

(د) چونکہ عہد نامے کی تجویز برطانوی سرکار اور ہندوستان کی دستور بنانے والی جماعت کے درمیان کی گئی تھی۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بعض اہم باتیں اس عہد نامے کے اندر نہ آئیں مثلاً ہندوستان اور یونانی ڈکٹنگ ڈم کے آئندہ کے تعلقات، مظاہرہ کہ ایسی اہم باتوں کے متعلق فیصلے کرنے کا حق دستور بنانے والی جماعت کو نہیں بلکہ اس نئی ہندوستانی حکومت کو پہنچا جانیے جو دستور بنانے والوں کی محنت اور چھان بین کے بعد پیدا ہوتی، کچھ لوگ کبھی کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید ان واقعات سے جو ۱۹۲۵ء کے آئر لینڈ کے عہد نامے کے "سلسلے میں" پیش آئے تھے ہندوستان کے مسئلہ پر بھی

روشنی پڑتی ہے۔ اہل میں ایسا نہیں ہے۔ آئرش فری اسٹیٹ کا قائم کرنا ایک نئے ہندوستان دستور بنانے کے پانگ بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی پوری آبادی شہر کلکتہ کی آبادی سے بھی کم ہے۔ اس کے علاوہ آئرلینڈ میں انگریزی سرکار کا معاملہ جن آدمیوں سے تھا۔ اُن میں آپس میں اتنا ایک تھا کہ وہ کامیابی کے ساتھ ایک وقتی حکومت بنا سکتے اور چلا سکتے تھے۔ آئرلینڈ اور ہندوستان کے حالات میں یہ فرق بھی تھا کہ وہاں جو جھگڑا تھا وہ یونانی ٹوٹکنگ ڈوم کے دو حصوں کے درمیان تھا۔ دونوں ایک ہی دستور کے ماتحت تھے۔ اور ان کی علیحدگی میں قانونی پہلو صرف اتنا تھا کہ آئرش فری اسٹیٹ کو اس سیاسی سمبندھ سے جس کا وہ پہلے حصہ تھی کاٹ کر الگ کر دیا جائے ۛ

یہ سوال کہ عہد نامے کا طریقہ مناسب ہے یا نہیں — اب قریب قریب ختم سمجھنا چاہیئے۔ انگریزی سرکار مان چکی ہے کہ آگے چل کر ہندوستان کا مسئلہ اسی طریقہ سے طے ہوگا۔ اور ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ پبلک کی رائے بھی اب یہی ہے کہ آئندہ ایک عہد نامہ ہونا ہی پڑے گا ۛ

کرپس کے اعلان پر ہندوستان میں بہت زیادہ اعتراض ہو چکے ہیں اور اس مضمون میں ہم اس کی عام بھلائی برائی کی بحث چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سوال پر کہ کرپس کی تجویز ہندوستان کو سوراخ کی طرح ایک قدم آگے بڑھانے کے لئے کافی ہے یا نہیں بہت زیادہ، بلکہ اکتا دینے والی حد تک بحث مباحثہ ہو چکا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کرپس کی تجویزوں کے کچھ پہلوؤں کی تو بہت زیادہ چھان بین ہوتی ہے۔ اور کچھ کی اتنی ہی کم۔ آنے والے زمانے میں ہندوستان کے بین الاقوامی تعلقات۔ اور اس کے بچاؤ کا سوال — یہ دونوں چیزیں ہندوستان کے لئے حد درجہ اہم ہیں لیکن کرپس کے نقشہ سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ آئندہ ان کی صورت کیا ہوگی۔ ہندوستان اور یونانی ٹوٹکنگ ڈوم دونوں جگہ جو پبلک بحثیں ہوئیں ان میں

بھی ان سوالوں پر کافی توجہ نہیں کی گئی اور نہ یہ غور کیا گیا کہ دونوں ملکوں کے تفصیلی سمجھوتے میں ان باتوں کی اہمیت کیا ہوگی؟

ان باتوں کی دو ایک مثالیں یہاں دی جاتی ہیں جن کے بارے میں کرپس کی تجاویز بالکل خاموش ہیں۔ مثلاً ان تجاویز میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ جو دیسی ریاستیں یونین سے باہر رہنا چاہیں گی۔ ان کے حق کی حفاظت کیسے ہوگی اور ان کے بچاؤ کی ذمہ داری انگریزی سپاہ پر ہوگی یا یونین کی فوجوں پر۔ اسی طرح سے کرپس کے اعلان میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ہندوستان اور اس کی ترکیبی ریاستوں کی حیثیت ان ملکوں کے مقابلہ میں کیا ہوگی جو اس کی خشکی کی سرحدوں سے ملی ہوئے واقع ہیں۔ نہ اس کا کوئی ذکر کیا گیا کہ ان ملکوں کے ساتھ ہندوستان کے آج کل کے تعلقات جو برطانوی سرکار کے واسطے قائم ہیں آگے چل کر کس طرح براہ راست بنائے جائیں گے۔ اعلان میں یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ آئندہ دست درازی کی صورت میں ہندوستان اپنے آپ کو کیونکر بچائے گا۔ اور اس علاقے میں بین الاقوامی امن و امان قائم رکھنے میں اس کا حصہ کیا ہوگا؟

ایک عہد نامے میں ہندوستان کی ان تمام مزدوروں کا انتظام ضرور ہونا چاہیے جو قوموں کے خاندان کے ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے اسے پیش آئیں گی ہندوستان کے گھر کے جھگڑوں نے اس انتظام میں الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ اس ملک کے سامنے سب سے بڑا سوال ہندو مسلم مسئلہ ہے۔ خواہ ایک ملک کی حیثیت سے ہو یا دو الگ الگ ریاستوں کی حیثیت سے ہندوستانی یونائیٹڈ کنگ ڈم کے ساتھ اسی صورت میں عہد نامہ کر سکتا ہے جب یہ اندرونی جھگڑا ختم ہو جائے اگرچہ یہ سوال ہندوستان کے لیڈروں کے حل کرنے کا ہے لیکن برطانیہ کو بھی چاہئے کہ صرف دور سے کھڑے کھڑے تاثر نہ دیکھے بلکہ اسے سلجھانے میں خود بھی حصہ

چاہے ہندوستانیوں کو اسے اپنے میں تامل اور رنج ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پہل برطانیہ کی طرف سے ہونا ضروری ہے۔ اس پہل کے بغیر ہندوستانی مسئلہ سلجھ ہی نہیں سکتا اور جب تک یہ مسئلہ سلجھ نہ ہو ہندوستان اور برطانیہ بین الاقوامی حیثیت سے ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں بٹا سکتے۔ اور جب تک یہ نہ ہو بین الاقوامی سلامتی ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔ آج ہندوستان کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ یہاں ایک سچی دیش بھگتی، سچا حب وطن جنم لے۔ سو ویٹ روس کے بعد ہندوستان ہی ایشیا کی سب سے بڑی آئندہ طاقت ہے۔ اس کا انتظام پائیدار اور اس کا عدالتی نظام مضبوط ہے۔ اس کی فوجی روایتیں شاندار ہیں۔ اس لڑائی کے بعد ہندوستانی فوج اتنی مضبوط ہوگی جتنی وہ شاید کبھی پہلے نہ ہوئی ہوگی۔ شہری آزادی کے خیالات اب ہمارے قومی تانے بانے میں اچھی طرح رچ کچ گئے ہیں۔ ہندوستان کو زبردست معاشی اور صنعتی موقعے حاصل ہیں لیکن یہ موقعے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب پہلے وہ مذہبی جھگڑا جس نے ہماری سیاسیات میں بس بھر دیا ہے ختم ہو جائے۔ ابھی تک یہ آس باقی ہے کہ شاید اب بھی ہندوستان کو قومی ذمہ داریوں کا خیال پیدا ہو جائے۔ باہر کی طوفانی دنیا کے ساتھ نباہ کرنے میں جو خطرے ہیں انہیں سمجھ لیا جائے اور اس طرح قومی ایکسا پیدا ہو جائے۔ اور اس ملک کے لوگ آپس میں مل کر ان جھگڑوں کو نبٹا سکیں جن میں آج انھوں نے اپنا سارا تن من پھنسا رکھا ہے۔ لیکن جو سنساری سو جہ بوجھ رکھنے والوں کی نظر میں گھریلو جھگڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے :

ہندوستان کا نیا دستور بناتے وقت اگر یہ فرعن کر لیا گیا کہ یہاں کے گھریلو اور بدیسی مسئلے ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ اور گھریلو واقعات کا

کوئی اثر ہندوستان کی زمینی اور سمندری سرحدوں کی سلامتی پر نہیں پڑے گا تو یاد رکھئے کہ ہندوستان کے لئے بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس کے سولاج کی کامیابی کی امید بہت کم رہ جائے گی مسلم ہندوستان کچھم کے مسلم ملکوں کے ساتھ تصوری ہمدردی رکھتا ہے۔ اور آثار بتا رہے ہیں کہ ہندو ہندوستان کو بھی شاید چین اور ہندوستان کی اتری پور بی سرحد کے ملکوں کے ساتھ ایسی ہی ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ایسے لوگ بھی بڑی گنتی میں موجود ہیں۔ اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ جو سوڈن روس کے تصوروں کے ساتھ گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ اس جھگے کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں جو ڈراڑ پڑ گئی ہے وہ فرقہ واری تقسیم کو کاسٹی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر کسی اور وجہ سے نہ بھی ہو تو بھی اس ایک بات کو ہندوستانی سیاسیات کے طالب علم کو سوچنا سمجھنا چاہیئے کہ بین الاقوامی بچاؤ اور گھریلو مسئلوں میں کتنا گہرا تعلق ہے ؟

ان مسئلوں کو طے کرنا، اور کرپس کی تجویزوں میں جو جگہ جھوٹ گئی ہے اسے بھرنے کوئی آسان بات نہیں ہے — خاص کر اس وجہ سے کہ بڑی بڑی طاقتوں نے اب تک آپس میں یہ طے نہیں کیا ہے کہ ایشیاء کی سلامتی کے لئے آگے چل کر کس قسم کا بین الاقوامی انتظام کیا جائے گا۔ اس وجہ سے ہندوستان کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آگے چل کر اُسے اپنے بچاؤ کے لئے کتنی فوجوں اور کتنے سامان کی ضرورت پڑے گی۔ پچھلے تین برس میں ہندوستان پر سمندر اور خشکی دونوں طرف سے حملہ ہو چکا ہے اور اس کے کچھ شہروں پر بموائی بم باری بھی ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے بچاؤ کی ہر تجویز میں ان تینوں قسم کے حملوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ یعنی ہندوستان کے پاس اس کا اپنا اچھے قسم کا بیڑہ، فوج، اور بموائی طاقت ہونی چاہئے

بدقسمتی سے ہندوستان اپنے ڈومین درجہ کی شروع کی منزلوں میں یہ سب ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو سکے گا۔ اسے اپنے بچاؤ کے ایسے انتظام میں جس میں اسے باہر سے مدد لینے کی ضرورت نہ پڑے کچھ دیر لگے گی۔ اب تک ہندوستان یونانی ٹڈکنگ ڈم کامن ویلتھ اور خود اپنے طے جُملے ویلوں پر بھروسہ کرتا رہا ہے۔ غرض کہ درمیانی زمانہ میں ہندوستان کو اپنے سول (شہری)، اور فوجی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے باہر سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی۔ اسے ایک بڑے تجارتی بیڑے اور سول ہوا بازی کے پورے پورے انتظام کی ضرورت ہوگی ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جو عہد نامہ بھی ہوا اُس میں ان سب باتوں کے لئے بل محل کر کام کرنے کا طریقہ ڈھونڈ لکنا بہت اہم ہو گا :

آئیو الے ابواب میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ آگے چل کر جو مسئلے حل کرنا ہیں۔ ان میں سے کچھ کی چھان بین کی جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان مسئلوں پر غور کرنے سے پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ بات صاف ہو جائے گی کہ ہندوستان اور برطانیہ کے آئیو الے تعلقات کس قسم اور کس حیثیت کے ہوں گے۔ اس مضمون کے آخر میں ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ بادشاہ سلامت کی حکومت کو کچھ اعلان فوراً کر دینے چاہئیں۔ اور ہندوستان کا اپنا دستور بنانے کے لئے جس انتظام کی ضرورت ہوگی اس کے بارے میں بھی کچھ تجویزیں بتائی گئی ہیں :

جو حل بتائے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کی بنیاد پر بات چیت کی جاسکے اور کہیں کہیں ان کی عبارت ایسی رکھی گئی ہے کہ اس سے بحث مباحثہ کو شہ طے کوئی شک نہیں کہ ہماری چھان بین میں کچھ ایسے کھانچے رہ گئے ہیں جنہیں بھرنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر اس مضمون سے غور و فکر، سوچ بچار کا راستہ کھل جائے تو گویا اس کا مطلب پورا ہو گیا :

اس مضمون میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ لکھنے والے کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ سرکاری اور خاص کر سرکار ہند کی رائے سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

پہلا باب

بچاؤ کے مسئلے

پچھلا زمانہ اور آج کل

دوسری سنساری لڑائی سے پہلے ہندوستان کے پاس ایک چھوٹی ٹیسی مستقل فوج اور لام بندی کی صورت میں مجردین اور مقولین کی جگہ بھرنے کے لئے ایک چھوٹا سا ریزرو (محفوظ حصہ) تھا۔ اس کی ہوائی طاقت کسی گنتی میں نہ تھی۔ اور شاہی ہندوستانی بیڑا بنایا جاتا تھا۔ فوج کی تقسیم، میدانی فوج، حفاظتی فوج اور انڈین آکس پی ٹی شہر (مہمائی) فوج میں کی گئی تھی۔ حفاظتی فوج کا کام یہ تھا کہ ہندوستان کی خشکی کی سرحدوں پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ اس وقت تک دشمن کو روکے رکھے جب تک میدانی فوج مقابلہ کے لئے تیار نہ ہو جائے پچھلی لڑائی کے تجربے نے یہ بتا دیا تھا کہ شمال مغربی سرحد کے بچاؤ کی لائن مشرق وسطیٰ (مڈل ایسٹ) میں شروع ہوتی ہے، لیکن اس کا کسی کو سامان گمان بھی نہ تھا کہ ہندوستان کی فوج کو کبھی ایشیاء کے کسی لڑائی کے میدان میں کسی اعلیٰ درجہ کی کھدار فوج کا سامنا بھی کرنا ہو گا۔ اس لئے فوج کو کھدار سامان سے لیس کرنے پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ جب جرمنی کی دوبارہ ہتھیار بندی سے یورپ کے لئے خطرہ کا امکان پریشان کن حد تک بڑھ گیا۔ تب ہندوستان

کے فوجی حاکموں کو یہ خیال آیا کہ ہندوستان فوج کو کھلا رہنے کا پروگرام بھی شروع کرنا چاہیے۔ اپنے سمنہ ری بجاؤ کے لئے ہندوستان بالکل امپیریل (شہنشاہی) بیڑے کا محتاج تھا۔ ہوائی حملوں سے بجاؤ کی جوتہ بیریں آج کل کی جاتی ہیں۔ ان کا یہاں کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ ملکی امن و امان کا انتظام ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں میں فوج کو تقسیم کر کے کیا گیا تھا۔

جب موجودہ لڑائی کے زمانہ میں آزمائش کی گھڑی آئی تو معلوم ہوا کہ بجاؤ کے یہ سارے انتظامات ناکافی ہیں۔ اتنے زمانہ تک ایسے ناکافی انتظامات کو گوارا کرنے کی وجہ کچھ تو خود برطانیہ کی امن پسندی کی پالیسی تھی۔ اور کچھ یہ کہ سرکار ہند فوجی معاملات پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنے کا الزام اپنے سر لینے کو تیار نہ تھی۔ ہندوستان کی طرح خود یونانی ٹیڈنگ ڈم (سلطنت متحدہ) میں انگریزی حکومت جبراً در زیادتی کے اس سیلاب کے خلاف جو ۱۹۳۷ء سے آنا شروع ہو گیا تھا، احتیاطی کارروائیوں کو آخر وقت تک ٹالتی رہی اور اس بارے میں اس نے جو بے بصیرتی اور جھوٹا اطمینان دکھایا اس پر آئے دن کے زمانہ کے تالیخ نویس تعجب کریں گے۔ ہندوستان کے بارے میں جو دلیل پیش کی جاتی تھی، اور جس میں تھوڑا بہت وزن ضرور تھا۔ وہ یہ تھی کہ ہندوستان نے جس لے یو اسمبلی (قانون ساز مجلس) میں بجاؤ کے اخراجات کو گھٹانے کے جو ہنگامے چائے جاتے تھے ان کی وجہ سے ہندوستان کے بجاؤ میں کوئی اضافہ تو ہونی ممکن نہ تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرکار اگر چاہتی تو اس ہمدردی سے ضرور بجا طور پر فائدہ اٹھا سکتی تھی جو ہندوستان کے قومی حلقوں میں اسپین، چین اور جمہوریہ (ایسوسی ایشن) کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ جو اہل ہندو بھلے بندوں فاسٹرم (فسطائیت) اور نازیت کو انسانی سلامتی اور ترقی کا دشمن بنا چکے تھے۔ اگر دور اندیشی کی پالسی سے کام لے کر ہندوستان

کی چٹک رائے کو تیار کیا جاتا، اور اسے سمجھا دیا جاتا کہ ہندوستان چاروں طرف کے حملوں سے اسی صورت میں بچایا جاسکتا ہے جب وہ اخلاقی اور سامانی حیثیت سے تیار ہو جائے۔ تو حکومت کو پبلک کی حمایت ضرور حاصل ہو جاتی، اور ان ہزاروں قیمتی جانوں کا نقصان نہ ہوتا جو صرف تیاری کی کمی کی وجہ سے اٹھانا پڑا ہے۔

ادھر جاپان، ہاپوربی ایشیا کی فتح کے منصوبے بنا رہا تھا، جس میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ روس کو جرمنی اور جاپان دونوں طرف سے اپنے بچاؤ کی تیاریوں کی فکر تھی، اور چین آپس میں ایک کر کے اور اپنے بدیسی دشمن - جاپان - سے لڑنے میں لگا ہوا تھا۔ جرمن کارندے مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں فساد کے بیج بوریے تھے۔ ہٹلر اور جاپان کے جنگی کرتادھرتا ملی بھگت کر کے ایک ایسی زبردست قبضہ چال کا منصوبہ لگا کر رہے تھے کہ ان کی فوجیں ہندوستان کو پوری طرح فوجی گھیرے میں لیتی ہوئی وسطی مشرق میں آن ملیں۔ ہندوستان کے دشمنوں کی کامیابی میں اتنی کسر رہ گئی تھی کہ اب اس پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی چال کا پٹ پڑنا کسی طرح معجزے سے کم نہ تھا۔

جن باتوں نے ہندوستان کو بچا لیا وہ یہ تھیں :-

(الف) برطانیہ کی لڑائی میں انگریزوں کی فتح

(ب) مصر کا بچاؤ (اس لڑائی کے ایک نازک معرکے میں ایک ہندوستانی ڈویژن نے، ایک بکھر بند ڈویژن کی مدد سے حملہ کر کے مارشل گریزیانی کی کمان کے تین لاکھ سپاہیوں کی محوری فوج کو تباہ کیا) اور

(ج) ہندوستان کی یہ قابلیت کہ دشمن کے سے لے کر ہانگ کانگ تک سلطنت کے بچاؤ کے مورچوں میں جہاں جہاں کھانچے پڑے اس نے ان میں سے تقریباً ہر ایک کو بھر دیا۔

ایک ایسی حالت سے شروع کر کے کہ جب اس کے پاس تقریباً کچھ بھی نہ تھا، ہندوستان نے لڑائی کے تیسرے سال تک بیس لاکھ آدمیوں کی دالغیر (رضاکارانہ) فوج بھرتی کر لی تھی اور اسے (بھاری توپوں، ٹینکوں، ٹریکٹرز، لاریوں اور ہوائی جہازوں کو چھوڑ کر) اور ہر طرح کے سامان سے لیس کر دیا بلکہ متحدہ قوموں کی فوجوں کے لئے سامان کی تیاری میں بھی خاصا حصہ لیا۔ ہندوستان کی جنگ کے زمانہ کی صنعتیں امید سے کہیں بڑھ چڑھ کر پھیل گئیں۔ اور اب تک برابر ایسی گماگمی سے کام کر رہی ہیں جس کا کسی دوسرے زمانہ میں محفل سے یقین آتا رہتا رہتا ہندوستانی ایئر فورس (ہوائی فوج) کو بھی نئی نئی مشینیں مل گئیں اور ہندوستان کے محدود صنعتی وسیلوں کو دیکھتے ہوئے، شاہی ہندوستانی پڑا بھی ایک اچھی خاصی طاقت کا مالک ہو گیا۔ ہندوستانی رجمنٹوں کے پہچوں پر بصرہ، بغداد، طہران، دمشق، بن غازی، اناطولی، تونس، اٹلی اور برما کے نام ہمیشہ روشن رہیں گے۔ جب اس لڑائی کی تاریخ لکھی جائے گی، تو ہانگ کانگ، سنگاپور، اور ملائیا کی مصیبتوں کی داستانوں کے ساتھ ساتھ، ایک دردناک لیکن روشن پہلو کے طور پر ان سوراؤں کی کہانیاں بھی ہوں گی جنہوں نے اپنے کسی تصور یا کوتاہی کی بنا پر نہیں بلکہ انتہائی مجبوری اور مایوس کر دینے والے حالات میں بہادری کے کارنامے دکھائے، مشرق بعید میں جو شکستیں ہوئیں ان کی کسر اب ہندوستانی فوجیں اپنے ٹھوس کارناموں سے برتا اور اٹلی میں پوری کر رہی ہیں۔ خود وزیر اعظم نے جو ہمتی، پانچویں اور آٹھویں ہندوستانی ڈویژنوں اور برما کے مورچہ والی چودھویں فوج کی بڑے موٹے لفظوں میں تعریف کی ہے۔ ہندوستانی ہوائی فورس نے، باوجود اس کے کہ ایک زمانہ میں اس کے پاس امریکی اور آ۔ اے۔ ایف کے ہوا بازوں

کے مقابلہ میں گھٹیا درجہ کی مشینیں تھیں۔ ہندوستان کے ساحلی بچاؤ میں اور برما میں جاپانیوں کے خلاف تعزیت کے قابل کام کئے ہیں۔ شاہی ہندوستانی بیڑے نے بحر عرب کے راستوں کو دشمن سے صاف رکھا ہے اور جہاز سی قافلوں کی حفاظت میں پوری طرح مدد دی ہے۔ ریلوے ٹرک، وگنیں اور انجن ہندستان سے مشرق وسطیٰ کو بھیجے گئے ہیں، اور وسطیٰ ہندوستان پہلی مرتبہ اس قابل ہوا کہ ان جاپانی فوجوں کو جو اس کی پوربی سرحد پر حملے کی کوشش میں تھیں بری طرح شکست دے۔

آئینولے زمانہ میں ہندوستان کا بچاؤ

۔ اس لڑائی سے پہلے یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ شمال اور شمال مشرق کی طرف سے ہندوستان پر حملوں کو روکنے میں ہمالیہ پہاڑ ایک زبردست دیوار کا کام دے گا۔ اسی لئے ہندوستان کو شمال مغربی سرحد اور سمندر کی طرف سے بچانے کی تدبیروں پر غور کیا جاتا رہا۔ پچھلے زمانہ میں ہندوستان پر جتنے حملے ہوئے وہ قریب قریب سب کے سب شمال مغرب سے ہوئے۔ یورپین حملہ آور البتہ سمندری راستہ سے آئے یہی وجہ ہے کہ شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لئے ہندوستان کی چھوٹی سی فوج کافی سمجھی گئی، اور اپنے سمندری ساحلوں کی حفاظت کے لئے ہمارا ملک شاہجہاڑے کو ایک معمولی سی نقد مستم دسے کر مگن بیٹھا رہا۔ اس کے پاس کوئی تجارتی بیڑہ نہ تھا اور وہ اپنا ذاتی بڑا بیڑہ رکھنے کے قابل ہی نہ تھا۔

آج کل کی لڑائی میں بہت سے نئے اور صاف صاف واقعات ایسے ظاہر ہوئے ہیں جنہیں ہندوستان کے آئندہ بچاؤ کے سلسلے میں نظر کے سامنے رکھنا ہوگا۔ انھیں فوجی جغرافیہ کے واقعات کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے

فوجی امکانات کے اس بیان سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم کو اپنے پڑوسی ملکوں کی نیت پر کوئی شبہ ہے +

الف سنگاپور کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے اب ہندوستان کے ساحلوں کو سمندری راستہ سے ملے جلے ہوائی اور سمندری حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اسی لئے اب مشرق میں ملائیا، سیام، انڈونیشیا (ہند چین)، اور برما ہندوستان کے لئے اتنے ہی اہم حلقے بن گئے ہیں۔ جیسے کہ مغرب میں ایران اور افغانستان کیمرہ نہ کھاڑی میں ایک دشمن طاقت کی موجودگی ہندوستان کے لئے اتنی ہی خطرناک ہوگی جتنی کہ خلیج فارس میں۔ بنگال کے واقعات اب ہندوستان کے لئے اتنی ہی اہمیت اور دل چسپی رکھتے ہیں جتنے کہ مصر کے واقعات +

(ج) ہندوستان کی اٹری پور بنی سرحد اب خشکی کے راستہ حملے سے محفوظ نہیں رہی ہے +

(ج) ہمالیہ کی "پشت کوٹہ" جس کے اوپر سے اب ہوائی جہازوں کے ذریعہ چین کو رسد جا رہی ہے، چین کے اڈوں سے اڑ کر آئیوالی مضبوط ہوائی طاقت کو ہندوستانی شہروں پر بمباری سے نہیں روک سکتی +

(د) شمال مغربی سرحد کا بچاؤ اصل میں وسطی مشرق سے شروع ہوتا ہے عدن گویا ہندوستان کا جبرالٹر ہے اور خلیج فارس اور ہنزہ سونڈ کی حفاظت سمندر کے لئے ہندوستان کی سلامتی کے لئے حد درجہ اہم ہے۔

(ه) ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر طیارہ گاہوں کے لیے سلسلے کی وجہ سے اس ملک کے شمالی شہروں کو بمباری کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور پنجاب پر ہوائی راستہ سے حملہ آسان ہو گیا ہے۔ اگر جرمن قفقاز (کاکس) پار کر لیتے یا روس ہار جاتا تو ہندوستان کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کا بچاؤ بڑا مشکل

کام ہو جاتا۔

(د) بحر ہند پر قابو رکھنا ہندوستان کی سلامتی کے لئے عدد درجہ ضروری

ہے۔

یہ یقین فوجی ضروریات اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ان کے بیان کرنے سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہم اپنے کسی پڑوسی ملک کی نیت ہندوستان کے بارے میں مخالفانہ سمجھتے ہیں، لیکن کسی ملک کے بچاؤ میں سیاسیات کا بھی اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا کہ ہتھیاروں کا۔ یہ سوال کہ ملک کے بچاؤ کے لئے کتنی فوجی طاقت کی ضرورت ہوگی اس پر منحصر ہے کہ اس کے سیاسی رشتے کتنے اثر والے ہیں اور ان کا رخ کیا ہے اس لئے ہندوستان کے بچاؤ کی تدبیریں سوچتے، اور اس ملک کے سیاسی ڈھچک کو ان کے ساتھ ربط دیتے وقت ہمیں اپنی توجہ ہندوستان کی سرحد یا پھیرنی چاہیے، اور چاہے عارضی اور قیاسی ہی کیوں نہ ہو، تھوڑا بہت اندازہ لگانا چاہیے کہ آنے والے دن اسی سال میں مختلف دوستوں میں آپس میں کون کون سے نئے مجموعے اور جوڑ توڑ بنیں گے۔ آئندہ کے امکانات کے بارے میں شاید ذیل کے اندازے کچھ زیادہ بے جا اور نامناسب نہ ہوں گے:-

(الف) اس لڑائی کے بعد روس یورپ اور ایشیا دونوں ملکوں کی سب سے بڑی فوجی طاقت ہوگا۔ جاپان کی ہار سے اور ایک فوجی طاقت کی حیثیت سے۔ چاہے وہ تھوڑے ہی زمانے کے لئے کیوں نہ ہو۔ جاپان کے مٹ جانے کی وجہ سے روس کی پوربی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی۔ دکھنی سرحدوں پر روس کے پاس بحر اسود (بلیک سی) سے لے کر سنک یا تنگ تک نہایت محفوظ فوجی اور ہوائی اڈوں کا ایک سلسلہ ہوگا۔ خلیج فارس پر چین گلف ہینک روس کو پہلے ہی سے دستہ مل گیا ہے اور آئندہ بحر اسود کا راستہ بھی اس پر پوری طرح بند نہیں

کیا جاسکے گا۔

(ب) اسی طرح، جاپان کی شکست کی وجہ سے چین کو بھی فوجی فائدے حاصل ہوئے۔ چین کا مستقبل ابھی تک ہندو ہے، اور ایسے کڑے کاروبار بہت کم ہیں جو یہ سمجھتے ہوں کہ لڑائی کے بعد چین کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی، یا یہ کہ کومن ٹانگ اور کمیونسٹوں (اشتراکیوں) کے افسوس ناک جھگڑے آسانی سے بند ہو جائیں گے، لیکن اس میں شبہ کی بہت کم گنجائش ہے کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد چین ایک طاقتور اور بڑا ملک بن جائے گا۔ بلکہ شاید اتھری اور فساد کے دور سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کی وجہ سے چین کی سلطنت آگے چل کر فوجی رنگ کی ہو جائے۔ یہ لازمی بات ہے کہ لڑائی کے بعد چین کی بجائی کے پروگرام میں زبردست فوجوں کا انتظام ضرور شامل ہو گا۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم اس لئے ایسا ہونا ضروری ہے کہ جاپانیوں کی دراز دستی سے جو مصیبت اس ملک نے اٹھائی ہے وہ اُسے آئندہ اٹھانی پڑے۔

(ج) پس یہ امید کی جاسکتی ہے کہ روس اور چین دونوں ملکر ایشیا کے شمالی آدھے حصہ کے بچاؤ کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ ایک طرف تو یہ زبردست فوجی ڈھچکا ہو گا اور اس کے مقابلہ میں ایشیا کا جنوبی آدھا حصہ اختلافات بلکیوں کہنا چاہیے کہ "معلقانیت" کا شکار رہے گا۔ یہ دو بات ہے کہ ہندوستان اپنے اثر سے تھوڑا بہت تال میل اور ایک باقی رکھے۔ جنوبی ایشیا کا یا پھر کہنا چاہیے کہ بحر ہند (ہند ساگر) کے علاقہ کا جو خاص سیاسی ڈھانچہ ہے باہر کی دنیا نے اس کا بہت کم مطالعہ کیا ہے اور اس کی وجہ سے امن و امان کو جو خطرہ ہے اسے بہت کم سمجھا ہے۔ ہندوستان کو چھوڑ کر ایشیا کے جنوبی آدھے حصے کے سب ملک بہت چھوٹے اور ان کی فوجی حیثیت بہت کمزور ہے جسے ایشیائی معیشت سے

دیکھتے تو مختلف جزیرہ نمائوں اور جزیروں کی نقشہ بندی کی وجہ سے ان ملکوں کے بچاؤ کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس علاقہ کی آئندہ زندگی کا دار و مدار سمندری بچاؤ پر ہوگا۔ اس لئے جب تک بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں ہتھیاروں میں کمی نہ ہو ہندوستان کو اپنی سلامتی کے لئے، اور جس علاقہ میں وہ واقع ہے اس کے امن و امان کے لئے اس کی ضرورت ہوگی کہ یا تو خود اپنی اعلیٰ درجہ کی نئے قسم کی فوجی مشینری ایک مضبوط ہوائی بیڑہ، شہری ہوا بازی کا نظام اور ایک کافی سمندری بیڑہ رکھے، یا پھر کسی دوسرے ملک سے ان باتوں کی امداد حاصل کرے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہندوستان اکیلا جنوبی ایشیا کے وسیع علاقوں کے بچاؤ کا ذمہ نہیں لے سکتا، اور نہ ہندوستان یہ کر سکتا ہے کہ زمانہ کے ملین کے خلاف اپنے چھوٹے چھوٹے ہمسایہ ملکوں پر زبردستی اپنا حفاظتی راج قائم کرے لیکن ایک بڑی طاقت یا ہونے والی بڑی طاقت کی حیثیت سے ہندوستان کے اوپر بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ اور دنیا کی سلامتی کے عام نظام میں بے ضرور حصہ لینا چاہیے۔ ہندوستان کے لئے جو انتظام تجویز کیا جائے گا وہ شاید یہ ہوگا کہ وہ بڑا تہ دوئی میزوں (نوآبادیات) اور شاید کسی حد تک امریکہ کے ساتھ مل کر عدل اور سنگاپور کے بیچ کے علاقہ کے امن و امان کی کچھ ذمہ داریاں قبول کرے۔

ایشیا کے شمال اور جنوب کے آدھے آدھے حصوں میں فوجی قوتوں کی نئی ترتیب سے یہ لازم آتا ہے کہ فوجی معنوں میں یہ دونوں حصے ایک دوسرے کا پلہ برابر رکھیں۔ آج کل کے خیالات کا رخ بتا رہا ہے کہ آئندہ علاقہ داری سلامتی کے ایسے نظام کو زیادہ پسند کیا جائے گا جس میں کسی ایک ملک کو ضرورت سے زیادہ بڑی فوجیں نہ رکھنی پڑیں۔ لیکن کچھ بڑائی اور موجودہ زمانہ کے بیچ میں جو

گزر رہا ہے اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا کی سلامتی، خصوصاً چھوٹے ملکوں کی سلامتی کا سوال ہتھیاروں کی عام کمی سے حل نہ ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ ایشیا کے بڑے عظم میں فوجوں کی نئی ترتیب کا نتیجہ یہ نکلے کہ شمالی آدمے حصے کی سلامتی تو چین اور روس کے ذمہ کر دی جائے، اور چونکہ ہندوستان برطانوی کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کا ممبر ہے، اور اس وجہ سے ایک خاص طاقت کا مالک ہوگا، اس لئے جنوبی آدمے حصے کی ذمہ داری اسے سونپ دی جائے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ دونوں علاقہ دار نظام ایک دوسرے کے ساتھ تال میل کیوں نہ رکھیں اور ایک سے دوسرے کو مدد کیوں نہ ملے۔ آپس کے اس تال میل کا قدرتی طور پر یہ نتیجہ ہوگا کہ پورے براعظم کے لئے جو فوجیں ضروری ہوں گی ان میں کفایت ہو سکے گی۔ اور عام فائدہ کی خاطر ہر ملک کو جو بوجھ اٹھانا پڑے گا اس میں بھی کچھ کمی ہو جائے گی۔ اور پھر اس انتظام سے بڑی دولتوں کو چھوٹی دولتوں پر کوئی ناجائز برتری بھی حاصل نہ ہو سکے گی بلکہ اگر دیکھا جائے تو چھوٹی باتدار ریاستوں کی حفاظت اور بچاؤ کا ضامن صرف اسی قسم کا نظام ہو سکتا ہے۔

حالات کی اس چھان بین میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے کہ ہندوستان کو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے کتنی فوجی قوت کی ضرورت ہوگی۔ قدرتی طور پر یہ سوال فوجی ماہروں کے سوچنے کا ہے۔ یہیں جن چیزوں سے تعلق ہے وہ یہ ہیں:-

(الف) یہ بتا دیا جائے کہ تمام ایشیائی ملک اپنی عام سلامتی کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

(ب) یہ ثابت کر دیا جائے کہ جب تک ہندوستان مضبوط اور اندرون طور پر متحد نہ ہوگا وہ ایشیا کی سلامتی کے بارے میں اپنی ذمہ داری پوری نہ کر سکے گا۔

(ج) یہ بتا دیا جائے کہ اگر ہندوستان سولہ آٹے خود اپنی طاقت پر بھر دے
 ذیہی کرے بلکہ کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) میں شامل رہے تو بھی اسے اپنے بچاؤ کی ضرورتوں
 کے لئے صنعتی ترقی کے ایک بہت بڑے پروگرام پر عمل کرنا ہوگا جس میں جہاز ریلوے
 ریلوے انجن، موٹر کار اور ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے بھی شامل ہوں گے امن کے زنگ
 کی صنعتوں کا انتظام اس طرح کرنا ہوگا کہ اس سے نہ صرف ضرورت پڑنے پر جنگی
 سامان کی تیار سی کام لیا جاسکے بلکہ انہیں باہر کے ملکوں سے بھی بچایا جاسکے۔

(د) یہ بتا دیا جائے کہ ہوائی اور سمندری بچاؤ کے سلسلہ میں ہندوستان اور
 سلطنت متحدہ (یونائیٹڈ کنگڈم) ہندوستان اور آسٹریلیا، اور ہندوستان
 اور جنوبی افریقہ کے درمیان گہرے تعاون کی ضرورت ہے، اور
 (ہم) اس بات کو تاکید کے ساتھ بیان کر دیا جائے کہ ہندوستان کی ڈومین
 اور سلطنت متحدہ (یونائیٹڈ کنگڈم) کے درمیان جو عہد نامہ بھی ہو اس میں بچاؤ کے
 مشترکہ مسائل لازمی طور پر شامل ہونے چاہئیں۔

اوپر کے فقرہوں میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان کی بنا پر بہت ممکن ہے
 کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ہندوستان ہتھیار بندی کا ایک ایسا پروگرام شروع کرے گا
 ہے جس سے وہ خود آگے چل کر ایک دست درازا درسا مرا جی قوم بن جائے گا۔ جو لوگ
 ہندوستان کے باشندوں اور ان کے تصوراتی مقصودوں سے واقف ہیں وہ اس
 قسم کے شبہوں کو ہرگز اپنے دل میں جگہ نہ دیں گے ہندوستان ایک امن پسند
 ملک ہے۔ امن اور شانتی کا پرچار اسے اس دلیں کی روایت ہے۔ اگر ہندوستان
 اپنی آنکھوں سے جاپان اور جرمنی کی غارتگری کو نہ دیکھ چکا ہوتا تو ضرور اس کا رجحان
 تحقیق اسلحہ کی طرف ہوتا لیکن جنگ کے بعد کے دور میں جو یقیناً امن اور سکون کا
 دور نہ ہوگا، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اپنے کو جو کم مین ڈال دے اور

اپنی سلامتی کا اتنا خیال بھی نہ کرے جتنا کہ دوسری بڑی دلدلوں کو ہے پس ہندوستان کی پالیسی یہ ہوگی کہ اپنے اثر سے کام لے کر ہتھیاروں کی تخفیف کرے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہر ایسے نظام کی حمایت کرے جس سے عام سلامتی کی آس بندھتی ہو۔ اس کے لئے جیسا کہ اب عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے، امن پسند دولتوں کے ہاتھوں میں بھی کچھ نہ کچھ موثر فوجی طاقت کا ہونا ضروری ہوگا۔ باقی رہا یہ سوال کہ سلطنت متحدہ اور ہندوستان کے آئندہ تعلقات کیا ہوں، اس مسئلے پر ٹائمز نے اپنی ۱۴ اگست ۱۹۱۹ء کی اشاعت میں منہایت قابل تعریف پیرایہ میں اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے:-

”ہندوستان کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان برطانیہ کی طرف سے کیا جا چکا ہے اس کی کامیابی متحدہ اقوام کے لئے حد درجہ اہم ہے۔ ہندوستان پر اس کے قدرتی وسائل اور حسد رانی حالات کی وجہ سے دنیاوی نظام میں بین الاقوامی حیثیت سے حصہ لینے کی جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ اُسے صرف اسی صورت میں پورا کر سکتا ہے کہ یہ پالیسی کامیاب ہو۔ ہندوستان کو بھاری ذمہ داریاں اٹھانی ہوں گی۔ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بننے کی جو صلاحیتیں ہندوستان میں موجود ہیں ان کی وجہ سے اس علاقہ کو آئندہ دست درازی سے بچانے میں ہندوستان کا حصہ ناگزیر ہوگا۔.....“

آئندہ چل کر ہندوستان اور برطانیہ کے جو تعلقات بھی ہوں مہذب دنیا کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان تعلقات کی بنیاد بھی شراکت پر ہو۔ یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اگر اس وقت برطانیہ اور ہندوستانی مدبر ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے تو ہندوستان کی مشکلیں حل

نہ ہو سکیں گی، برطانیہ کی نیت چاہے کتنی نیک ہو لیکن صرف اسی سے کام دے گا۔
 اور آگے چل کر ہندوستان کی آزادی کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو ہندوستان کو اس
 کی ضرورت ہے اور اسے حق پہنچنا ہے کہ وہ برطانیہ سے کہے کہ آؤ اور ہمارے گھر کی
 حالت سدھارو۔ سچی حوتی کے لئے دو باتیں ضروری ہیں پہلی بات تو یہ کہ ہر سرپرست
 دوسرے فریق کی مشکلات سمجھنے پر آمادہ ہو، اور دوسرے یہ کہ وسیع تر مفاد کو
 محض کسی شخصی، فرقہ واری، یا قومی دقتار کی خاطر پس پشت نہ ڈال دیا جائے۔

دوسرا باب

بین الاقوامی ملاحظات

محکمہ امور خارجہ

باہر کے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات اب تک زیادہ تر لندن کے دفتر خارجہ کی عام ہدایت اور نگرانی میں طے پاتے ہیں بدیسی ملکوں میں بادشاہ مسلا کی حکومت کے نمائندے ہندوستان کے مفاد کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی سرکار ہند کے محکمہ امور خارجہ کے کام اور اس کی اہمیت میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ شروع شروع میں اس محکمہ کا کام شمال مغربی سرحد کے مقامی انتظامی اداروں اور بلوچستان کی دیکھ بھال، اور قبائلی علاقوں اور سرحدی ریاستوں سے متعلق تھا لیکن اب اس قسم کا کام پھیل گیا ہے۔ یہ پھیلاؤ اس وقت سے شروع ہوا جب پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد افغانستان اور نیپال پوری طرح خود مختار ریاستیں بن گئیں، اور ان ملکوں کے لئے انگریزی نمائندوں کا انتخاب اس سروس کے ممبروں میں سے ہوتا رہا جسے اب انڈین پولیٹیکل سروس کہتے ہیں ان دونوں ملکوں اور برطانیہ کے تعلقات کو ہندوستان کے خارجی تعلقات کی حیثیت سے دیکھنے کا رجحان حال میں نمایاں ہوا ہے۔ آج کل کی لڑائی نے سرکار ہند کو یہ

سمجھا دیا ہے کہ اب وہ اپنی نظریں اپنی قریبی سرحدوں اور اپنے قریبی ہمسایوں سے اور آگے بڑھائے۔ چین امریکہ اور روس ہندوستان کے اتحادی بن گئے، ان کے اور ہندوستان کے درمیان معاشی کڑیاں مضبوط ہو گئیں۔ لڑائی کے مختلف میدانوں میں ہندوستانی فوجوں کے بھیجے جانے کی وجہ سے نئے تعلقات پیدا ہوئے اور نئے مسئلے وجود میں آئے۔ اب آج کل سرکار ہند امریکہ اور چین کی حکومتوں کے ساتھ براہ راست سفارتی تعلقات رکھتی ہے اور شاید جلد ہی وسطی مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے ساتھ بھی ایسے ہی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اب ہندوستان اپنے ہائی کمانڈر مختلف دومی فینوں (نوآبادیات) میں مقرر کر رہا ہے، اگرچہ ان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات محکمہ امور خارجہ کی بجائے محکمہ تعلقات دولت مشترکہ (کامن ویلتھ ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ) کی نگرانی میں ہیں۔

امور خارجہ کا موجودہ محکمہ پرانے محکمہ سیاسیہ (خارجہ دفاتر) اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی ایک شاخ ہے جو امور خارجہ اور دیسی ریاستوں دونوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لئے قائم ہوا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے قانون کی رو سے دیسی ریاستوں سے متعلق مسئلے گورنر جنرل باحلاس کونسل کی اختیاری حدود سے نکال لئے گئے اور اب نمائندہ تاج کی ذمہ داری میں آگئے ہیں جس کا عہدہ گورنر جنرل کے عہدے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ محکمہ سیاسیات (پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ) کے نام سے ایک الگ محکمہ بنا دیا گیا ہے جو نمائندہ تاج کے ماتحت ہے، اور محکمہ امور خارجہ کا قلمدان دائرے کے پاس ہے۔ ان دونوں محکموں کے افسران اینڈ پولیٹیکل سرور کے آدمی ہوتے ہیں جس میں اب تدریجی طور پر ہندوستانیوں ہی کے تقررات ہو رہے ہیں +

محکمہ امور خارجہ کا کام یہ ہے کہ بادشاہ سلامت کی حکومت کو ہندوستان

کے خارجی معاملات اور ضرورتوں کے بارے میں صلاح مشورہ دے۔ جبکہ ہندوستان کو لڑائی کے بعد ڈومینیئم کا درجہ دینے کا وعدہ ہوا ہے اس محکمہ کی سرگرمیاں اور ذمہ داریاں آئے دن بڑھتی جا رہی ہیں اس کا کام کچھ اس طرح رہ رہ کے اور بے نیچے پن کے ساتھ پھیلا ہے کہ اب باہر کے ملکوں میں ہندوستان کے خاص معاملات کا مکمل جائزہ لینا ضروری ہو گیا ہے۔ خارجی معاملات میں بادشاہ سلامت کی حکومت اور سرکار ہند کے درمیان جو اشتراک مفاد آج کل موجود ہے اس میں ابھی کافی عرصہ تک غلغلہ نہ پڑنا چاہیے، ورنہ ہندوستان کے خارجی تعلقات میں اجڑی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہندوستان کو آئندہ بادشاہ سلامت کی حکومت کی سفارتی مصلحت (ڈپلومیسی) کا ساتھ دینا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے کسی چلیسی بنائی جائے اس میں بھی برطانیہ کے دفتر خارجہ کے وسیع اور کئی برس کے تجربے سے فائدہ اٹھائے۔ اس سے بھی زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان ہندوستانیوں کا ایک سفارتی زمرہ بنایا جائے اور انہیں باہر کے ملکوں میں سفارتی عہدوں پر کام کرنے کی تربیت دی جائے۔ ہر ملک کا تجربہ بتاتا ہے کہ سیاست دانوں کو خواہ وہ پبلک زندگی میں کتنے ہی قابل اور ممتاز کیوں نہ ہوں، باہر کے ملکوں میں نامحاذ بنا کر بھیجا خطرناک ہوتا ہے تا وقتہ کہ ان کے عملے میں ایسے آدمی نہ ہوں جو سفارتی پالیسی اور طریقہ کار کے گروں سے واقف اور تربیت یافتہ ہوں۔

پچھلے دس سال کی مدت میں آہستہ آہستہ ہندوستان کی سمندر پار کی تجارت براہ راست اس کی اپنی تجارت میں آتی جا رہی ہے۔ اب ہندوستانی ایجنٹ اور تجارتی کمشنر، امریکہ، کناڈا، جنوبی امریکہ، مصر، ایران، افغانستان، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ اور آسٹریلیا میں موجود ہیں۔ لڑائی سے پہلے توکیو، برلن اور میلان

میں بھی ہندوستان کے تجارتی نمائندے رہا کرتے تھے۔ چونکہ سرحدست پیر و فی ملکوں
ان تجارتی کمشنروں کو کوئی سفارتی مرتبہ حاصل نہیں ہے اس لئے خالص تجارتی
معاملات کے علاوہ اور باتوں میں کارروائی کرنے سے وہ معذور ہیں اور تاہم
انہیں سفارتی مرتبہ نہ دیا جائے وہ کسی قسم کا مفصلی کام نہیں کر سکتے۔ تجارت اور
معاشیات دونوں سفارتی تعلقات کا اہم جزو بن چکے ہیں ضرورت اس کی
ہے کہ محکمہ تجارت (کامرس ڈیپارٹمنٹ) اور محکمہ امور خارجہ میں باہمی مفاہمت پیدا
کی جائے تاکہ ہمارے تجارتی نمائندے ان دونوں محکموں کے اطمینان کے مطابق
اپنے دہرے فرائض پورے کر سکیں اس کی سب سے بہتر صورت یہی ہو سکتی ہے کہ نوجوان
ہندوستانی سفارتی عہدہ داروں کو محکمہ تجارت کی نگرانی میں کام سکھایا جائے اور
ساتھ ہی محکمہ تجارت کے عہدہ دار محکمہ امور خارجہ کے کاموں کی واقفیت حاصل کریں
محکمہ امور خارجہ کے وہ کون سے خاص کام ہیں جو فی الوقت دل چسپی کا موضوع
بنے ہوئے ہیں ان بڑے بین الاقوامی معاملات کی بحث جو ہمیشہ درپیش رہتے ہیں اور جو
ہندوستان اور سامری دنیا میں مشترک ہیں، ہم مناسب مقام پر کریں گے، لیکن
ان کے علاوہ کچھ ایسے روایتی اور مہارت طلب معاملات بھی ہیں جن کا تعلق ہندوستان
کی قریبی سرحدوں سے ہے اور جو اس محکمہ کے دائرہ عمل میں داخل ہیں۔ ان سے ایک
میلحدہ باب میں بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

تیسرا باب

قبائلی علاقے اور سرحدی ریاستیں

ہندوستان کی شمال مغربی اور شمال مشرقی دونوں سرحدوں پر ایسے منطقتے موجود ہیں جنہیں قبائلی علاقے کہا جاتا ہے اور جو برطانوی ہندوستان کی انتظامی حدود اور ہندوستان کی بیرونی سرحدوں کے درمیان حد فاصل ہیں۔ دو جگہوں کے سوا سوائے، جن میں سے ایک بلوچستان میں ہے اور دوسرا شیری گڑھ وال اور کسی جگہ ہندوستان کی انتظامی حدود اور بیرونی سرحد ایک دوسرے سے نہیں ملتی ان قبائلی علاقوں کی رعایا نیم خود مختار قسم کی ہے اور حکومت ہند کے ساتھ اس کے تعلقات گورنر جنرل کے ان ایجنٹوں کے توسط سے قائم ہیں جن کے علاقہ میں وہ آباد ہے۔ سرکار ہند کی پالیسی برابر یہ رہی ہے کہ ان علاقوں میں تدریجی طور پر بود و باش کے باقاعدہ حالات پیدا کیے جائیں، چنانچہ اس غرض سے اس نے مقامی اور قبائلی زندگی کے ڈھچھ کو دھچھکا کر بغیر شکرین ہسپتال اور مدرسے بنائے ہیں اور معاشی حیثیت سے ان علاقوں کو ترقی دی ہے۔ ان علاقوں کے مقامی پولیس افسروں کے سامنے سب سے بڑا سوال پہرہ چوکی کا ہے۔ چونکہ قبائلی باشندے نیم وحشی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے علاقے

معاشی حیثیت سے پست ہیں، اس لیے وہ آس پاس کے برطانوی اضلاع پر کبھی کبھی
 دھاوے بول دیتے ہیں سرحد پر امن وامان کے انتظام کے سلسلہ میں ایک اعلیٰ درجہ
 کی شہری فوج وجود میں آگئی ہے، جس نے سرحد پر پہرہ چوکی کی اعلیٰ اور بہادرانہ روایا
 قائم کر دی ہیں۔ اس فوج کی تنظیم نیم فوجی اصولوں پر کی گئی ہے۔ لیکن اس کا اعتماد
 زیادہ تر اپنی نقل و حرکت کی قابلیت اور جسمانی صلاحیت پر ہے، اور وہ جھڑپ
 بازی میں جو قبائلی باشندوں کا خاص مشغلہ ہے خود ان سے بھی سبقت لیجاتی ہے
 ٹوچی اور جنوبی وزیرستان کے اسکاوٹوں، کرم کی ملتیا جمعیت پتھرال اور
 گلگت کے اسکاوٹوں اور آسام رائفلز کے نام خاص معروف اور مشہور ہیں
 اور ان کے تفصیلی بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ ان جمعیوں میں زیادہ تر ایسے نوجوان
 فوجی افسر جاتے ہیں جنہیں ہم جوئی کا شوق ہو۔ ان علاقوں کے اندرونی انتظام کی
 ذمہ داری پولیس افسروں پر ہوتی ہے جو قبائلی چودھریوں کے توسط سے، اور قبائلی
 دستور کے مطابق ان کے مقامی جھگڑے چکاتے ہیں۔ قبائلی باشندوں میں سے
 بعض نہایت اعلیٰ درجہ کی سپاہیانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے پچاو
 اور ہندوستان کی سرحدوں کی سلامتی میں ان کی خیر خواہی اور دوستانہ تعلقات
 سے قابل قدر مدد ملتی ہے۔ موجودہ لڑائی میں ناگاکا پہاڑی کے قبیلے والوں نے جو مدد
 کی ہے وہ بھولی نہیں جاسکتی، اور نہ اسے جھلانا چاہیئے پس ان علاقوں میں ان
 امان اور انتظامی نگرانی قائم رکھنا ہندوستان کی سلامتی اور امن وامان کا ایک لازمی جزو

سرحدی ریاستیں۔

ان میں سب سے زیادہ اہم بلوچستان کی ریاستیں، قلات، لاس بیلہ اور
 خاران شمال مغربی سرحدی صوبہ کی ریاستیں دیر، سوات اور پتھرال، گلگت (پنجشیر) کی

ریاستیں۔ ہنزہ، ناگہ، پنیال اور کوہ غزرا اور ہمالیہ کے دامن میں سکھ اور بھوجان ہیں۔ ان ریاستوں کو ناماندہ تاج کے ماتحت ایسی ریاستوں کا درجہ حاصل ہے لیکن ان کے خاص حالات کی وجہ سے ان کے معاملات کا تعلق محکمہ امور خارجہ سے ہے۔ ہندوستان کی سرحدوں پر ان ریاستوں کے محل وقوع کی وجہ سے ان کے مسائل "خارجہ" نوعیت کے بن گئے ہیں۔ دراصل ان علاقوں کے اندرونی انتظام میں دخل دینے کی ضرورت بہت کم پڑتی ہے۔ خوش قسمتی سے ان میں بسنے والے قبیلوں میں ایسے لیڈر پیدا ہو گئے ہیں جو ان پر حکومت کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے ان ریاستوں کی خاص اہمیت یہ ہے کہ وہ اس سرحد پر جو ان کے علاقوں کے اندر واقع ہے امن و امان قائم رکھ سکیں۔ ان کی وجہ سے ہندوستانی خزانہ پر ان چھوٹی مہموں کا بار نہیں پڑنے پاتا جو کبھی کبھی، اور خاص طور پر ایسے علاقوں میں ضروری ہوتی ہیں جہاں کے قبیلے بے سردار کے ہوں اور جہاں پہرہ چوکی کی ذمہ داری سرکار ہند کے سر ہے۔ ان سرحدی حکمرانوں میں سے بعض روشن خیال ہیں اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے علاقوں میں نظم و انتظام کے اعلیٰ طریقے رائج کیے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کی ایک متنازعہ مثال والی سوات ہیں جنھوں نے قبائلی لوگوں سے ہتھیار رکھوا کر نہ صرف اپنے علاقہ میں پہرہ چوکی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے بلکہ امن پسندانہ مشاغل، مثلاً کھیتی باڑی اور گھریلو صنعتیں پیدا کر کے اور سڑکیں بنوا کر اور ٹیلیفون کا ایک اچھا سلسلہ قائم کر کے صحتی علاقہ میں امن و امان قائم رکھنے کی ایک قابل تقلید مثال پیش کر دکھائی ہے۔ بد قسمتی سے ان قبائلی علاقوں میں جہاں کوئی سردار نہیں ہے لوگ اتنے انفرادیت پسند ہوتے ہیں کہ ان میں ایسے سردار پیدا نہیں ہوتے جن کا حکم سب مانیں۔ ایسے قبیلوں کے ساتھ سرکار ہند کو لازمی طور پر براہ راست سردکار رکھنا پڑتا ہے۔

حاجی ریاستیں

افغانستان:۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب ہندوستان کے طول و عرض میں انگریزی راج قائم ہو گیا تو سوائے روس کے ایشیاء میں کوئی اور طاقت ایسی نہیں تھی جس سے ہندوستان کو خطرہ ہو۔ چنانچہ صحیح یا غلط طور پر انگریز روس ہی کو اپنے ایشیائی مقبوضات کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھنے لگے۔ افغانستان کے ساتھ لڑائیاں اور ایران کے معاملات میں انگریزوں کی چارناچار دلچسپی۔ یہ اسی خون کا قدرتی نتیجہ تھے افغانستان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کئی دوروں سے گزر چکے ہیں ایک خاص عہد نامہ کی رو سے افغانستان کی ان حدود کا جو روس اور ہندوستان سے ملتی ہیں تعین کیا گیا اور روس اور انگلستان دونوں نے افغانستان کی سرحد کے احترام کی ضمانت کی۔ ۱۹۱۹ء کی تیسری جنگ افغان کے بعد انگریزوں نے افغانستان کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا، اور ہندوستان اور افغانستان کے درمیان ایک عہد نامہ کی رو سے افغانی درآمد اور برآمد کے لئے ہندوستان میں ایک آزاد راستہ قائم کر دیا گیا۔ افغانستان ایک پہاڑی ملک ہے جس کے مشرقی اور جنوبی حصوں میں پٹھان یا افغان قبائل آباد ہیں جو ہندوستان کی سرحد کے اندر رہنے والے اپنے ہم قبیلہ لوگوں کے ساتھ گہرا ربط اور سماجی اور معاشی تعلقات رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس نئی قسم کی رائفلیں ہیں، اور ان کی شور و ہشتی ضرب المثل ہے۔ چنانچہ جب کبھی افغانستان کے اندرونی امن و امان میں خلل پڑتا ہے تو اس کا اثر ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر ضرور پڑتا ہے۔ شمالی افغانستان کی آبادی تاجیک اور ازبکوں پر مشتمل ہے جو ترک نسل کے لوگ ہیں۔ اور جن کے کچھ گروہ سوویت روس

لے ایسی ریاست جو دکنوروں کے درمیان بطور حجاب واقع ہو (دفتر سیٹھ)۔

میں بھی آباد ہیں۔ مغربی اور جنوب مغربی علاقوں کے باشندے ایرانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ احمد شاہ درانی کے حملہ ہندوستان کے بعد سے افغانستان کے حکمران خاندان کا سلسلہ کسی نہ کسی درانی قبیلہ ہی سے رہا ہے۔ موجودہ حکمران خاندان بارک زئی قبیلہ کی محمد زئی شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ شاخ قندھار میں آباد ہے۔ تقریباً سارے افغانی سنی اور حنفی المذہب ہیں۔ حال میں حکمران طبقہ کی طرف سے ملک میں تعلیم اور جدید خیالات کو رواج دینے کی زبردست کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان اور افغانستان آپس میں بڑے پیمانہ پر تجارت کرتے ہیں۔

افغانستان کی خاص برآمدیں بھمور، قالین اور تانہ اور خشک میوے ہیں۔ ہندوستان افغانستان کو پٹرول، شکر، چاء، لکھوں طرح کی استعمالی چیزیں اور شینری بھیجتا ہے۔ افغانستان کے پاس اپنی کوئی بندرگاہ نہیں ہے اور وہ اپنی سمندر پار کی تجارت کے لیے ہندوستانی بندرگاہوں کا دست بگر رہا ہے۔ اس طرح ان دونوں ملکوں کے درمیان ایک قریبی معاشی رشتہ قائم ہے۔

افغانستان کی خود مختاری اور ہندوستان کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات یہ دونوں چیزیں ہندوستان کے بچاؤ کے لیے ناگزیر ہیں۔ فوجی، سیاسی، معاشی، تجارتی اور ثقافتی پھول غرض کہ حقیقت سے ہندوستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس طرح بھی ہو کے افغانستان کے ساتھ اپنی ہمسائیگی کے تعلقات کو اور زیادہ مضبوط بنائے۔

نیپال شمال اور شمال مشرق میں ہندوستان کی سرحد کے ڈانڈے چین سے ملتے ہیں۔ نیپال اور تبت کے علاقے جو چالیہ سے لگے ہوئے ہیں ہندوستان اور چین کے درمیان حد فاصل ہیں۔ نیپال کے ساتھ ہندوستان کا لگاؤ ان دو

لڑائیوں کی وجہ سے ہوا جو ہندوستان کو اپنی حفاظت کے لیے لڑنی پڑی ہیں۔
 عہد نامہ سگوئی کی رو سے کچھ علاقہ ہندوستان کو مل گیا۔ اور نیپال کے ساتھ
 اس کے تعلقات مضبوط، دوستانہ بنیادوں پر قائم ہو گئے۔ گورکھے جو کسی زمانہ میں
 ہندوستانی اور بنگالی فوجوں کے خلاف بہادری سے لڑتے تھے
 بعد کو ہندوستان کی لڑیت فوجوں کا خاص حصہ بن گئے۔ لاکھوں نیپالی آج ہندوستان
 میں سول مشاغل میں کچھ ہوئے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد نیپال کی خود مختاری
 تسلیم کر لی گئی اور بعد کو ایک تجارتی اور معاشی عہد نامہ کی رو سے نیپال کو بھی ہندو
 کے ساتھ درآمد برآمد کی وہی آسانیاں دی گئیں جو افغانستان کو حاصل ہیں۔

نیپال ایک ہندو ریاست ہے، اور اگرچہ اس کے پہاڑی علاقہ کے باشندے
 بدھ مت کے پیرو ہیں اور نسل کے اعتبار سے منگول ہیں، پھر بھی یہ ملک بجائے بت
 اوچھین کے ہندوستان ہی کو اپنی قدرتی گزرگاہ سمجھتا ہے۔ نیپال ایک پست حال
 ملک ہے اور ضرورت ہے کہ اسے صنعتی بنایا جائے۔ ہندوستان کی طرف سے
 اس ملک میں نئی باتیں رائج کرنے کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ ایک طرح سے خود
 اس ملک (ہندوستان) کے لئے فائدہ مند ہوگی کیونکہ اس طرح ہندوستان کی
 تجارت کی مقدار بڑھے گی اور یہاں کے ہندو مزدوروں کو کام ملے گا۔ اس لئے
 نیپال کی خبر خواہی حاصل کرنا ہندوستان کے لئے بہت زیادہ قدر قیمت رکھتا ہے
 سیاسی حیثیت سے نیپال ہندوستان اور شمال کے درمیان ایک طرح کی حجابی
 ریاست ہے تہذیبی حیثیت سے ہندو ہندوستان کے ساتھ اسے گہرا لگاؤ ہے۔

یہی وہ دیس ہے جہاں شرمع شرمع میں مہاتما بدھ نے سفر کئے۔ گورکھے ہمیشہ ہندوستانی
 فوجوں کا ایک قابل قد بجز بنے رہیں گے۔ بڑے افسوس کی بات ہوگی۔ اگر ہندوستانی
 قوم پرست نیپال اور افغانستان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں

وسعت نظر سے کام نہیں لیں گے، اور انتہائی بدبخشی ہوگی اگر مسلم ہندوستان کو ان میں سے ایک اور ہندو ہندوستان کو دوسرے ملک کی طرف سے پھیرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح ان دونوں ملکوں کے ساتھ پورے ہندوستان کی دوستی کو غارت کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے نیپال اور افغانستان دونوں ملکوں کے حکمران طبقے اس بارے میں ان عناصر سے زیادہ دور اندیش ہیں جو ہندوستان کی سیاسی زندگی میں انتشار پھیلاتے آچکے ہیں۔ افغانستان اور نیپال کی حکومتیں ہندوستان کو ایک ملک اور اس کے باشندوں کو ایک قوم مانتے ہیں۔ ادھر اکثر سمجھدار اور بصیرت رکھنے والے ہندوستانی بھی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح سے بین قومی سیاسیات میں فرقہ واریت پیدا کرنے کے اس رجحان کی جو ان کے کسی قدر کوتاہ اندیش ہوطنوں میں پیدا ہو گیا ہے روک تھام کریں۔

مہرتبت ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ نیپال اور تبت دونوں خود مختار ملک ہیں تبت کی حیثیت کسی تشریح چاہتی ہے۔ چین تبت کو اپنا ہی ایک حصہ سمجھتا ہے لیکن علامہ اے تبت والوں نے چینی فوجوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا، اس کے بعد علامہ اے تبت والے میں شملہ میں ایک تین فریقی کانفرنس اس غرض سے کی گئی کہ چین کے مقابلہ میں تبت کے مرتبہ اور اس کی سرحدوں کو معین کر دیا جائے، لیکن چین کی نئی جمہوری حکومت نے اس کانفرنس کے فیصلوں کو رد کر دیا۔ برطانوی حکومت کی پالیسی اس بارے میں یہ ہے کہ وہ تبت پر چین کے حق اقتدار کو ماننے پر تیار ہے بشرطیکہ چین بھی تبت کی خود مختاری کو ایک امر واقعہ کی حیثیت سے مان لے اور اس کا احترام کرے۔ اس کے بعد سے تبت نے چین کے بجائے سرکار ہند کو اپنے خارجہ تعلقات کا واسطہ بنا لیا ہے چونکہ اب ہندوستان اور چین دونوں تبت کی مقامی خود مختاری میں دل چسپی رکھتے ہیں اور دونوں ملک یہی چاہتے ہیں کہ تبت اپنی روایات کے بموجب ترقی کرے اس لئے تبت کے

مسئلہ پر اب ان دونوں ملکوں کے درمیان کسی غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ تبت ایک زمین بستہ ملک ہے اور سمندر تک اس کے پہنچنے کا فاصلہ چین کی بہ نسبت ہندوستان ہو کر کم ہے۔ اس لیے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنا تبت کے لیے زیادہ آسان ہے۔ ہندوستانی تاجر تک، سالے اور استعمالی چیزیں وہاں بھیجتے ہیں اور تبت ہندوستان کو ریشم اور اون بھیتا ہے ہندوستان و تبت کی درمیانی سرحد کی کچھ علاقے ابھی تک پوری طرح معین نہیں ہیں لیکن اس کی وجہ سے ان دونوں ملکوں کے درمیان کبھی کوئی غلط فہمی پیدا ہونے نہیں پائی۔ یہ مسئلہ دوستانہ بات چیت سے طے ہو جائے گا اگر میں سرکار ہند کے نمائندے کی موجودگی سے دونوں ملکوں کو اپنے آپس کے سیاسی معاشی اور تہذیبی تعلقات کو مضبوط بنانے کا موقع ملتا ہے۔ تبت کے باشندے بعض باتوں میں اشیاء کے سب سے اچھے لوگ کہے جاتے ہیں۔ ان کے سیاسی اور حکومتی معاملات بدھ مت کے نصب العین کے مطابق ہیں چنانچہ دلائی لاما اور اس کے ماتحت لاماؤں کی حکومت جو حکومت الہیہ کے اصولوں پر چلائی جاتی ہے اس کا ثبوت ہے۔ ہندوستان اور تبت کے باشندے آپس میں گہرا تصوراتی تعلق رکھتے ہیں چنانچہ تبت والے سنکرت حروف تہجی استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف بدھ مت نے ہندوستان ہی میں جنم لیا تھا نقل و حل کے نئے نئے طریقوں کی وجہ سے اب ہمالیہ پہاڑ ویسی رکاوٹ نہیں رہا جیسا کہ پہلے تھا بھی سال دو سال کی بات ہے کہ قازقوں کے جتھے کے جتھے تبت سے گھومتے ہوئے شمالی راستوں سے کشمیر آ رہے تھے۔ تبت میں تجارت کی ترتی کے بڑے امکانات ہیں اور ہندوستان بھی، بشرطیکہ وہ اس ملک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ آج کل بھی ہندوستان سے جو رسدیں جاتی ہیں وہ تبت کے راستوں ہی سے جاتی ہے۔

چوتھا باب

ہندوستان کے ہمسائے

(الف) خلیج فارس

ایران اور عرب کے وہ حصے جو خلیج فارس کے ارد گرد واقع ہیں اور جزیرہ بحرین۔ ان سب کو ملا کر خلیج فارس کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں زیادہ تر عرب ریاستیں ہیں۔ وسطی عرب کے بدوؤں یا ان قبیلوں کے مقابلہ میں جو عرب کے جنوبی ساحل کے آس پاس واقع ہیں، خلیج فارس کے علاقہ کی آبادی ملی جلی سمندری سفر کی عادی اور تجارت اور کاروبار کی شائق ہے۔ یہاں کے بازاروں میں آپ کو بڑے ہوشیار کاروباری لوگ نظر آئیں گے۔ بحرین ہی وہ مرکزی مقام ہے جہاں پچھلے سو برس میں برطانیہ کے سرکاری اغراض کے اثر سے جدت پسندی کا دور شروع ہوا اور اب امریکہ کے تجارتی اغراض کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستان اور خلیج فارس کے علاقوں کے درمیان صدیوں سے تجارت اور باہمی ربط چلا آ رہا ہے۔ سمندری ڈاکوؤں کی روک تھام اور سمندری راستوں کی حفاظت کے سلسلے میں ہندوستان نے اس علاقہ میں بہت کچھ

روپیہ اور خون بہایا ہے اور اسی کے نتیجہ کے طور پر آج ہندوستان کی سیاسی ریزیڈنسی بحرین میں قائم ہے اور خلیج فارس کا علاقہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے سیاسی اثر کے تحت آگیا ہے۔ ہندوستان سے ملے چاول، گیہوں، کپڑا، استعمالی چیزیں اور شنیری خلیج کے علاقہ میں برآمد ہوتی ہیں، اور وہاں سے تیل اور کھجور وغیرہ کی درآمد ہوتی ہے۔ بحرین کے موتی ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ حال کے ایک انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور خلیج کے علاقہ کے درمیان تجارت کی مالیت ڈو کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ ہندوستانی فرموں نے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ہیں خاصہ نام پیدا کر لیا ہے، اور وہاں ان کی بڑی عزت ہے۔ ہندوستان سے جو زائر عراق جاتے ہیں وہ خلیج کے راستہ ہی سے جاتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے تعلقات مزے تاریخی اور زمانہ قدیم کے نہیں ہیں بلکہ نقل و حمل کے وسیلوں کی تبدیلی سے آئندہ اور گہرے ہو جائیں گے۔ خلیج فارس ہندوستان اور یورپ کے درمیان ہوائی راستہ پر واقع ہے۔

اس علاقہ کے ساتھ ہندوستان کی دلچسپی صرف معاشی معاملات ہی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ خلیج کے علاقہ کی سلامتی اور خود مختاری میں گہری دلچسپی خود اس کے اپنے بچاؤ کے لئے بھی ضروری ہے پھیلی اور موجودہ دونوں جنگوں میں ہندوستان کے بچاؤ کی لڑائیاں وسطی مشرق میں لڑی گئی تھیں اور ہندوستان کی سلامتی کو دشمن کی طرف سے جو خطرہ تھا اس کی روک تھام کے لئے ہندوستان کی ممانی فوجیں خلیج ہی کے راستہ سے گئی تھیں۔ جاپانیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر

جرمن قفقاز پار کر لیں تو وہ اسی علاقہ میں ان کے ساتھ مل جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس علاقہ نیز عدن پر جس ملک کا بھی تصرف ہوگا وہ ہندوستان اور پوربی افریقہ، اور انگلستان اور اسٹریلیا کے درمیان سمندری راستوں کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ انہی مفادات کی حفاظت کے لئے ہندوستان نے ایک خاص پالیسی بنالی ہے اور اس کی تکمیل کے ضروری انتظامات بھی کر لئے ہیں۔ مقامی شیوخ اولہ حکمرانوں کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات خلیج فارس کے ریزڈنٹ کے توسط سے قائم ہیں جس کے ماتحت کئی پولیٹیکل افسر ہیں۔ ہندوستان اور برطانیہ کے آئندہ تعلقات پر غور کر لے وقت ان حقوق کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا جو ان حکمرانوں کو عہد ناموں کی رو سے حاصل ہیں۔ ہندوستان میں اس علاقے کے باشندوں کے لئے جدید سائیکلک طریقے سیکھنے اور ایسی عام تعلیم حاصل کرنے کے بے شمار موقعے ہیں جن کی بدولت وہ خود اپنے ملکوں کو ترقی کی راہ پر لگا سکیں۔

(ب) فارس یا ایران

اپنی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے ایران بھی ہندوستان کا اہم ہمسایہ ہے۔ ٹراس پرشین (مادرائے ایران) ریلوے نے روس اور خلیج فارس کے درمیان ایک نیا راستہ کھول دیا ہے اور جنگی رسد پہنچانے کے سلسلہ میں جو اور راستے بنے ہیں وہ خلیج فارس تک اور نشکی، زاہدان اور مشهد سے ہو کر آتے ہیں۔ ایران کے تیل کے چشمے ایشیا میں سب سے زیادہ سیر حاصل ہیں اور ان میں متعدد سندوستانی کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کو جن ذریعوں سے پٹرول ملتا

جسے ان میں ان چیزوں کا بھی خاص حصہ ہے اور جوں جوں ہندوستان کی صنعت
ترقی کر گئی کارخانے چلانے کے لئے ایران کے تیل کا استعمال اور بڑھ جائے گا۔
ہندوستان ایران کو چائے، کافی، کھانے پینے کی چیزیں اور استعمالی چیزیں برآمد کرتا
ہے۔ ہندوستان سے جو زائر عراق جاتے ہیں اور راستہ میں مشہد اور قم کی
زیارت گاہوں پر بھی حاضری دینا چاہتے ہیں وہ زابدان۔ مشہد کا راستہ
اختیار کرتے ہیں۔ ایرانی کلچر (ثقافت) نے ہندوستان پر بہت گہرا اثر ڈالا
ہے۔ اس نے ہماری شاعری اور فنِ تعمیر کو مالا مال کیا ہے۔ اکثر سماجی (سوشل)
رسوم آج بھی ہندوستانیوں اور ایرانیوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔

دو عالمگیر جنگوں کے درمیان جو زمانہ گزرا اس میں ایران نے ریاستی
اجارہ داری کی پالیسی شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے اس کے
ساتھ ہندوستان کی تجارت قریب قریب ختم ہو گئی۔ مغربیت پسندی
کی جو پالیسی رضا شاہ نے جبراً چلائی تھی اگرچہ اس کا اثر محض نمائشی اور
سطحی ہوا، پھر بھی اس کی بدولت ایرانیوں میں اپنی برتری کے متعلق کچھ
غلط فہمی ہو گئی اور ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں
کچھاؤ اور دوری پیدا ہو گئی۔ امید ہے کہ اب ایرانیوں کو کچھ سمجھ
آجائے گی اور تعلقات کا ایک نیا باب شروع ہو گا جس سے ایرانیوں
میں ہندوستان کے بارے میں پہلے سے زیادہ مفاہمیت پیدا
ہو جائے گی۔

ایرانی بڑے پر لطف اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ اس عربی اثر
کے باوجود جو ایران میں اسلام کے شروع ہونے کے بعد پھیلا،
انہوں نے اپنا الگ طرز زندگی قائم رکھا ہے۔ ان کی شاعری اور

ادبیات، فنون اور کلمہ سے ساری دنیا نے فیض پایا ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہوگی اگر ایشیا کا یہ مایہ ناز ورثہ محض مغرب کی سطحی تغالیٰ کی وجہ سے خراب ہو جائے۔ ایران اور ہندوستان دونوں ایک دوسرے کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ قدرت کا منشا، یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ملک اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں، اور آگے چل کر ایشیا کی نجات بھی ان کے آپس کے گہرے تعاون پر منحصر ہے۔ حال میں ایرانی کلچرل مشن (ہمیت فرہنگی ایران) کے ہندوستان کے دورہ سے آپس کی مفاہمت بڑھ گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ جب ہندوستان سے ایک مشن دورہ باز دید پر ایران جائے گا تو دونوں ملکوں کے درمیان پائیدار دوستی کا راستہ کھل جائے گا۔

پچھلے زمانہ میں ایران کے ساتھ ہندوستان کو جو کچھ دلچسپی رہی ہے وہ محض اس حیثیت کی وجہ سے تھی جو روس اور برطانیہ کے درمیان اس ملک کو حاصل تھی۔ خوش قسمتی سے ان دونوں ملکوں کی آپس کی رقابتیں اب ختم ہو رہی ہیں، اور اب روس، ایران اور برطانیہ کے درمیان ایک سہ فریقی عہد نامے کی رو سے، بیس سالہ دوستی کا معاہدہ ہو چکا ہے جس میں ایران کی آزادی کی بھی ضمانت کی گئی ہے۔ امریکہ نے بھی ان معاہدوں کی توثیق کر دی ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ شاید تعلقات کی یہ نئی تبدیلی پائیدار ثابت ہو۔ غرض کہ اب ایران کو اپنی آزادی اور اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھوئے کا کوئی اندیشہ نہیں رہا۔ اس علاقہ کی سفارتی (ڈپلومیٹک) بازیاں آئندہ دو فریقی نہیں بلکہ سہ فریقی ہونگی۔ تعمیر بعد جنگ میں ہندوستان ایران کے بہت کچھ کام آ سکتا ہے ادھر

سے ایران ہندوستان کو پہلے کی طرح ثقافتی (کلچرل) امداد پہنچا سکتا ہے سیاسی و معاشرتی حیثیت سے بھی دونوں ملک ایک دوسرے کے زیادہ قریب آسکتے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو یہ دونوں آئندہ چل کر جنوبی نصف ایشیاء کی سلامتی کے سلسلے کی اہم کڑیاں بن جائیں گے۔

(ج) سنک یا نگ

سنک یا نگ چونکہ چین کا ایک صوبہ ہے اس لئے وسط ایشیاء کے اس حصہ کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کو ہندی چینی تعلقات کا ایک جز سمجھنا چاہئے۔ موجودہ لڑائی کے شروع ہونے تک ہندوستان کے تعلقات اگرچہ چین کے کسی حصہ کے ساتھ قریبی اور گہرے رہے ہیں تو وہ سنک یا نگ ہی تھا۔ اس علاقہ کی خوش حالی میں ہندوستانی تاجروں نے بہت کچھ حصہ لیا ہے اور جان اور مال کا بڑا انتہا نقصان اٹھایا ہے، خصوصاً لڑائی سے فوراً پہلے جو زمانہ گذرا اس میں ہندوستانی تاجروں کی حالت یہاں ناقابل بیان تھی۔ مقامی نظم و نسق نے اپنی ایک علیحدہ حیثیت اختیار کر لی تھی اور محض برائے نام چین کی مرکزی حکومت کی پابندی کرتی تھی۔ من پسند ہندوستانی تاجروں کے ساتھ اس کی پالیسی ایذا رسانی اور بدسلوکی کی ہو گئی تھی۔ ان مشکلوں کے باوجود محض ہندوستانیوں کی جو صلہ بندی کی وجہ سے ہمارے ملک نے وسط ایشیاء میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا اور کاشغریں ہندوستانی قنصل جنرل کا دفتر کھل گیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سنک یا نگ میں ہندوستانی

پانچواں باب

جنوب مشرقی ایشیا

یورپ میں ہندوستان کے پڑوسی، جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ ہیں اور جنہیں ایک طرح سے ایشیا کا بلقان کہنا چاہیے، ایک الگ ہی علاقہ ہیں، اس لئے ان سے علیحدہ بحث کرنا ضروری ہے۔ ان ملکوں کو جن میں برما، سیام، ہنچینی، ملایا اور ڈچ ایسٹ انڈیز (مشرقی ہند کے جزیرے) شامل ہیں بعض اوقات ”باہری ہندوستان“ (FURTHER INDIA) کہا جاتا ہے۔ ہندوستان اور اس کے زمانہ قدیم کے نوآبادیاتی علاقوں میں جو رشتہ باقی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈچ لوگ مشرقی جزائر (ایسٹ انڈیز) میں اپنے مقبوضات کو ”ہندوستان“ اور اس کے مقابلہ میں خاص ہندوستان کو ”برطانوی ہندوستان“ کہتے ہیں۔ ہندوؤں میں پردیس کے سفر کی مانعت اور کالے پانی سے ان کی بیزاری یہ نسبتاً حال کی خصوصیتیں ہیں، ورنہ دو ہزار برس پہلے ہندو ملاح دور دراز سمندروں کو چھانا کرتے تھے۔ اس میں خدائشک نہیں کہ انہی ملاحوں کی وجہ سے ہندو آبادکار ہند چینی جزیرہ، ملائوٹو، شیا کے جزیروں اور فلپائن بلکہ شاید پیسفاک

میں اس سے بھی آگے تک پہنچے اس علاقہ میں جو ریاستیں انہوں نے قائم کیں وہ ہندو ہونے کی تھیں۔ سنسکرت ناموں کی بھرمار تھی۔ عبادت کا طریقہ بھی ہندوانہ تھا۔ یہ سلسلہ ایک ہزار سال سے اوپر تک چلتا رہا۔ جاوا کی سری وجے سلطنت جس نے بورو بودوکا مشہور مندر بنایا اہل میں ایک ہندو سلطنت تھی، اسی طرح سے کمبوڈیا کی سلطنت بھی جو تائیخ کے وسطی دور میں قائم ہوئی اور جس نے انگ کورداٹ کے مندر بنائے۔ وہ بھی ہندو سلطنت تھی۔

گیارہویں صدی میں انڈونیشیا اور جنوبی ہندوستان کے بیٹروں میں جو لڑائی ہوئی اور اس کے بعد بارہویں صدی میں عرب سمندی قزاقوں کے ہاتھوں ان دونوں کی تباہی نے اس علاقہ میں ہندوستان کے اثر کو کمزور کر دیا۔ ہندوستان کے ساتھ رسل و رسائل کا سلسلہ کٹ جلنے کی وجہ سے یہاں کے باشندے رفتہ رفتہ ہندو نہ رہے یا پھر انہوں نے اپنی ہندو تہذیب میں اسلامی، چینی، اور آخر میں چل کر مغربی خصوصیات داخل کر دیں۔ اس کے باوجود اس علاقہ میں اب بھی جس حد تک ہندو پن موجود ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سیام کے راج محل کی طرف سے بعض رلج ریتوں کو پورا کرنے کے لئے آج بھی ایک ہرہمن طبقہ کی پرورش جاری ہے۔ سیامی حروف تہجی کی اصل ہندوستانی ہی ہے۔ لوگ اب بھی سنسکرت نام رکھتے ہیں اور ہندوستان کو اپنی تہذیب کا گہوارہ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کمبوڈیا کی پرانی سلطنت میں جو اب ہند چین کا حصہ ہے قدیم ہندو درباری رسموں کی فرسودہ شکل اب بھی باقی ہے۔ ہم ایک ایک ملک لیکر یہ دیکھیں گے

کہ آج بھی ہندوستان کو اس علاقہ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ جنگ سے پہلے ان علاقوں میں ہندوستانی آبادی کا اندازہ حسب ذیل تھا:-

برما..... ۱۰,۵۸,۲۵

ملایا..... ۷,۵۰,۰۰

سیام..... ۵۵,۰۰

ہند چین..... ۵,۰۰ سے ۶,۰۰ تک

ٹوچ ایسٹ انڈیز..... ۲,۸۰,۰۰ سے ۳,۰۰ تک

تجارتی تعلقات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

ملک	برآمد	درآمد
چیزیں	مالیت	چیزیں
برما	کونلہ اور کوک، مچھلی، پھل، ترکاری، گہوں، کا آٹا، لوہا اور فولاد، مونگ پھلی، کاتیل، کاغذ، مونگ پھلی، چھالیا، شکر، چائے، روئی، سوت، کٹھپس، سن، کی مصنوعات، تمباکو، سگریٹ،	پھل اور ترکاری، وال، چاول (چھلکے دار)، دیاسلائیاں، سیسہ، مٹی، کاتیل، چکنڈ، فوٹ، تیل، ٹیڑول وغیرہ، ساگو ان،
ملایا	کونلہ اور کوک، رسیاں، روئی، کاسا، نان، چارہ، غلہ، دھاول، چٹڑ اور کھالیں، سن، کاسا، مان، بیج۔	بید، سوکھی مچھلی، ٹین، معدنی تیل، کھلنے پینے کا سامان اور اسٹرو، مسک،
	۸,۴۹,۰۰۰	۲۲,۴۹,۰۰۰
	۲,۰۰,۰۰۰	۱۳,۰۰۰

ملک	برآمد		درآمد	
	چیزیں	مالیت	چیزیں	مالیت
سیام	روئی کا سامان، سن - بورے	۶۹,۶۴,۰۰۰	سنگوان	۹,۴۲,۰۰۰
ہند چین	سن کا سامان	۶۸,۴۴,۰۰۰	متفرق چیزیں	۱۳,۹۳,۰۰۰
ٹچ ایٹ	کولہ اور کوک، چاول		معدنی تیل، شراب	
انڈیز	سن، بورے	۸۲,۴۳,۰۰۰	شکر	۱۵,۴۴,۰۰۰

برما

برما ۱۹۳۷ء میں ہندوستان سے علیحدہ ہوا۔ اس وقت سے اب تک ہندوستان اور برما کے سامنے کئی ایسے مسئلے آچکے ہیں جن میں دونوں کو دل چسپی ہے اور جنہیں ہمساگی کے اصولوں پر حل ہونا چاہئے۔ جنگ کے بعد کے زمانے میں سب سے پہلا فیصلہ طلب سوال برما میں ہندوستانیوں کے بسنے کا ہوگا۔ اگر ایک طرف ہندوستانی سربراہداروں کے ہاتھوں برمی لوگوں کے ناجائز استعمال کو ختم کرنا ہوگا، تو دوسری طرف اس کی امید کی جائے گی کہ اپنے ملک میں بسنے والے ہندوستانیوں کے بارے میں برمی باشندے وسعت نظر اور فراخ دلی سے کام لیں۔ ہندوستان کی عزت نفس کا تقاضا ہے کہ اس بات کا پورا پورا انتظام کر دیا جائے کہ وہ ہندوستانی جو ایک زمانہ سے برما میں بس گئے ہیں اس ملک کے مواقع سے مناسب اور منصفانہ فائدہ اٹھا سکیں۔ دونوں ملک ایک دوسرے کی خدمت کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ہندوستان پٹرول

چاہیے اور لکڑی کے بارے میں برما پر منحصر ہے، تو دوسری طرف برما خود کو ترقی دینے اور مشرق کی طرف سے حملے کی صورت میں ایک مشترکہ بچاؤ کی پالیسی بنانے میں ہندوستان کی مدد حاصل کر سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہندوستانی فوجوں نے برما کو فتح کیا تھا اور برما کی دودلڑائیوں کا پورا بار ہندوستان ہی کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ موجودہ لڑائی میں برما کے ہاتھ سنے کھل جانے سے ہندوستان کی سلامتی کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا۔ برما سے سپانی کے سلسلہ میں ہندوستان کو جان و مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو جانے سے ہندوستانی تحلیلہ کنندگان کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اسے ہندوستان ہر زمانہ تک نہیں بھول سکتا۔ ہندوستان یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی مشرقی سرحدوں پر جاپانی پھر کوئی حملہ کریں، اس لئے وہ سمندر اور خشکی دونوں راستوں سے آئندہ برما کے بچاؤ کی ذمہ داری لینے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ اس بارے میں دونوں ملکوں کے باہمی تعاون کی تفصیلات تو آگے چل کر طے ہوں گی، سر دست جو انتظام ممکن نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے وسائل اکٹھا کر لئے جائیں گے، اور آئندہ چل کر مشترکہ دل چسپی کے تمام مسئلوں کے بارے میں دوستی اور ہمسائیگی کی اہمیت میں سمجھوتا ہو جائے گا۔ ہندوستان کو برما کی آزادی میں ہمیشہ دل چسپی رہیگی اور چونکہ جنگ کے بعد دونوں ملک ڈومین کا درجہ رکھیں گے اس لئے ان میں آپس میں گہری مخالفت پیدا ہو جائے گی۔ ہمیں نہ بھولنا چاہئے کہ جب برما ہندوستان سے الگ کیا گیا تو خود اس ملک میں رائے عامہ کا ایک کافی حصہ اس عمل کے خلاف تھا۔ دونوں طرف سے نیک خواہی اور یکجانیت کی اس روشن علامت سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور خاص طور پر امن اور

سلامتی کے بارے میں گہرے تال میل کی بنیاد پر ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہئے۔

ملایا

ملایا میں پٹانگ اور سنگاپور یہ دونوں مخلوط قسم کے اور جدید طرز کے حصے ہیں جو صدیوں کے برطانوی تعلق اور تجارت کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ مسلمان سلطانوں کے نو علاقے ہیں جہاں کی زندگی اور اداروں پر آج کل کی کاروباری دنیا کے حالات کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا ہے۔ روسیوں کی حکومت کے برخلاف، پچھلے زمانہ میں برطانوی حکومت کا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جو ممالک اس کے زیر اثر ہیں اس کے باشندوں کی سادہ زندگی میں کم سے کم مداخلت کی جائے، جدید تہذیب کو آہستہ آہستہ پھیلنے دیا جائے اور عارضی ذریعوں سے تعلیم کی رفتار تیز کرنے کی بجائے اسے رفتہ رفتہ بڑھنے دیا جائے۔ ملایا میں برطانوی طاقت کی اب تک خود ملک کی طرف سے کوئی موثر مخالفت نہیں ہوئی ہے، لیکن اس جنگ سے برطانوی حکومت کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس ملک کو جلد سے جلد نئے زمانہ کے رنگ پر لانا کتنا ضروری ہے، اور ہندوستان ملایا کے اس تجربہ سے اتنا ہی خوش ہوگا جتنا کہ دولت عامہ کے اندر برطانوی آزادی پسندی (لبرلزم) کی اور دوسری علامتوں سے۔

خود ملایا کے اصلی باشندے اپنے ملک میں اقلیت میں ہیں ان کی تعداد ۲۲ لاکھ ہے۔ لیکن پچھلی مردم شماری کی رو سے چینیزوں کی تعداد ۳۳ لاکھ ہے۔ ہندوستانی جمعیت بھی خاصی یعنی ساڑھے سات لاکھ ہے۔ چینیزوں کے متعلق جو عجیب و غریب بات ملایا میں دیکھنے میں آتی ہے، وہ برطانوی سلطنت

کے کسی دوسرے حصہ میں نظر نہیں آتی، یعنی یہ کہ وہاں یہ لوگ چینی اور برطانوی دونوں قومیتوں کا حق رکھتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے ان میں سے اکثروں کی دل چسپی ملایا کے ساتھ اتنی نہیں ہے جتنی کہ چین کے ساتھ ہندوستانی آبادی میں زیادہ تر تامل قلی ہیں جو بر کے باغات میں کام کرتے ہیں، اور ایک مختصر سی تعداد پیشہ ور لوگوں اور قرض کا کاروبار کرنے والے ساہوکاروں کی بھی ہے، لیکن بدقسمتی سے اسے وہاں وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو چینوں کو ہے۔ برما کی طرح ملایا کے ساتھ بھی ہندوستان کی دل چسپی زیادہ فوجی اغراض کی وجہ سے ہے ۱۹۴۲ء میں۔ سنگاپور کا ہاتھ سے نکل جانا اس کے دفاعات کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلئے ہوا کہ اس کے بچاؤ کے لئے کافی فوجیں نہیں تھیں۔ سنگاپور کا بحری مرکز اب بھی پوربہر سمندروں کی اور اسی طرح خود ہندوستان کی سلامتی کی کنجی بن سکتا ہے۔ اگر اس کی اہمیت کو پوری طرح نہ سمجھا گیا تو آئندہ زمانہ میں یہ ہندوستان کے لئے اس سے بھی بڑی مصیبت کا باعث ہوگا جتنا کہ ۱۹۴۲ء میں اس کا ہاتھ سے نکل جانا۔

سیام

سیام اگرچہ ایک چھوٹا سا ملک ہے اور اس کے باشندے بھی نرم مزاج اور مرخاں مرتخ ہیں لیکن اس میں اندرونی طور پر ایک ایسی مضبوطی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان حالات میں بھی جن میں دوسری ریاستیں ختم ہو جاتی ہیں سیام پنپتا رہتا ہے۔ یہ ملک ایک قدیم شاہی سلطنت ہے لیکن اس پر سیاست دانوں کا ایک گٹ حکومت کرتا ہے نہ موجودہ بادشاہ چکری خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور پوری سیاسی آبادی

میں اسے جو وقعت اور اقتدار حاصل ہے اس پر کچھلے پندرہ سال کے واقعات کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا ہے۔ شہنشاہیت میں دستور پسندی کے اجزا کے شامل ہو جانے سے اگرچہ مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے، لیکن بادشاہ کے وقار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، ۱۹۳۷ء کے انقلاب کے بعد شروع کے چند سالوں میں۔ جنہیں آزادی پسندی کی منزلیں کہنا چاہئے۔ نہ صرف سیام کی شاہی استبداد کی روایات سے پاک ہو گئی، بلکہ اسے شاہی خاندان کی اس دھڑے بندی سے بھی نجات مل گئی جو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں کی اجارے دار بن گئی تھی۔ موجودہ بادشاہ آنندرا ماہی ڈول ابھی نابالغ ہے، اور چونکہ مارشل پی بی سونگرام کی پالیسی کے ساتھ، جو ڈکٹیٹر بن بیٹھا تھا اسے کسی قسم کا بھی لگاؤ نہیں ہے اس لئے کیا عجب ہے کہ لڑائی کے بعد بادشاہ کی ذات قوم کی نئی زندگی کا مرکز بن جائے۔ باہر کی دنیا کو سیام کے اندرونی واقعات کا جو کچھ علم ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ایک چھوٹے فوجی گٹ کے علاوہ جو ابھی کچھ دن ادھر تک حکومتی نظام پر قبضہ جمائے ہوئے تھا، سیام کی آبادی لڑائی سے بے تعلق بلکہ ایک حد تک جاپانیوں کی مخالف ہے۔ اگرچہ ہورتیں کے خلاف اعلان جنگ کرنے والوں کی معافی کا کبھی سوال پیدا ہوا تو سیام اس معافی کا زیادہ حقدار ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک جسے نہ برطانیہ سے فوجی ساز و سامان مل سکتا تھا اور نہ امریکہ سے، بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ اس نے بار بار ہوائی جہازوں اور پٹرول کے لئے التجائیں کیں جو منظور نہ ہو سکیں۔ ادھر تو اتحاد کا کسی طرح اس کی مدد کرنے کے قابل نہ تھے، ادھر سے جاپان نے اس کے اندرونی اور بین قومی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا اور آخر میں اس سے کہا کہ یا تو اتحادیوں کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلان کر دیا پھر اپنی ہستی سے

ہاتھ دھو بیٹھو۔

جنگ کے بعد سیام کے سامنے اور سٹلوں کے علاوہ بڑا مسئلہ اس کی چینی آبادی کا ہوگا، جس کی تعداد ۲۵ لاکھ ہے۔ چینی آبادی کی معیج گنتی مشکل ہے اس لئے کہ مشرق کے ملکوں میں سیام ہی ایسا ملک ہے جس نے چینیوں کو اس طرح اپنایا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ چینی ہے یا تائی! سیام کے جیسے چھوٹے ملک کو ہمیشہ اپنے پڑوسی چین کے دباؤ کا ڈر اور چینی پھیلاؤ کے ریلے کا خطرہ رہیگا۔ سیام اب تک محض بعض سخت تندرستی کی وجہ سے، خاص کر چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے سے انکار کر کے چینی آبادی کے دباؤ کی روک تھام کر سکا ہے۔

سیام کی تہذیبی روایتیں ہندووانہ ہیں اور ہندوستانوں کی اس دیں میں بڑی عزت ہے۔ لیکن سیام کے ساتھ ہندوستان کی خاص دلچسپی اپنے بچاؤ کے سلسلہ میں ہے اور اس حیثیت سے سیام کی وہی پوزیشن ہے جو ملایا یا ہند چین کی۔ ہندوستان سیام کو ہمیشہ ایک حجابی (بضر) ریاست سمجھتا رہا ہے۔ سیام کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے برا گیا۔ اور برما کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے ہندوستان کی پورب سرحد دشمن کے حملے کے لئے کھل گئی۔ اسی لئے ہندوستان کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو سیام کو غیر ملکی فوجی اثر سے پاک رکھا جائے اور اسے اس کی ترغیب دی جائے کہ اپنے بچاؤ کے انتظامات کو ہندوستان کے ساتھ مربوط کرے۔ اس کے بدلے میں سیام کو چاہیے کہ پورب جانے والی ہندوستانی چوٹی لائنوں کو اپنے ملک کے اوپر سے بے روک ٹوک جانے

دے اور چونکہ برما اور ملائیا کے درمیان ریلوے سلسلہ بھی مکمل ہو گیا ہے اسلئے ریلوے ٹریفک کے لئے بھی راستہ دے۔ بین الاقوامی غلط فہمیوں کی روک تھام اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب یہ سمجھ لیا جائے کہ خود مختار ہندوستان اپنی حفاظت چوکسی کے ساتھ کرے گا اور اپنے چھوٹے ہمسایوں کے ساتھ مضبوط معاشی اور تجارتی تعلقات قائم کر کے انہیں بھی اپنی وحدت قائم رکھنے میں مدد دے گا۔

ہند چین

فرانسیسی ہند چین میں اگر تھوڑی بہت جغرافیائی یا انسانیاتی وحدت یا سیاسی رابطہ پایا جاتا ہے تو وہ صرف فرانسیسی حکومتی نظام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ویسے یہ چیزیں وہاں موجود نہیں ہیں۔ ہند چین قوموں اور تہذیبوں کا ایک معجون مرکب ہے۔ آج کل یہ پانچ حصے اس کے ترکیبی اجزاء ہیں: (۱) انام کی سلطنت (۲) کمبوڈیا کی سلطنت (۳) لاوس اور (۴) ٹونکن جو دونوں حفاظتی راج میں ہیں۔ اور (۵) کوچن چین کی نوآبادی۔ مادی ترقیوں کے اعتبار سے فرانسیسوں کا اثر قابل قدر رہا ہے۔ انہوں نے ریلوے، سڑکیں، سمندری پلے اور آبپاشی کی نہریں بنائیں اور اعلیٰ تعلیم پھیلانے اور مشرقی علوم اور فن آثار قدیمہ کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ بعض حیثیتوں سے فرانسیسیوں کی حکومت نہ صرف آزادی کی مخالف بلکہ لوٹ کھسوٹ کی حکومت رہی ہے۔ انام کے قومیت پسند متوسط طبقہ کی طرف سے اس کی کافی مخالفت کی گئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں کمبوڈیا والوں نے آسانی سے بدیسی راج کو قبول کر لیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ فرانس نے کمبوڈیا کو انام اور سیام کے لگاتار حملوں سے بچایا اور وہاں کے بودھ سادھو

کو راضی کر لیا ہے۔

انام دالوں کی تہذیب چینی ہے۔ دو ہزار سال تک انام کی سلطنت، چینی سلطنت کی باجگزار رہ چکی ہے۔ اس کی زبان اگرچہ چینی نہیں ہے۔ لیکن فرانسیسی حکومت کے دور دورہ تک چینی حروف میں لکھی جاتی رہی ہے۔ اس کے راج میں جسے فرانسیسیوں نے باقی رکھا ہے جو درباری رسمیں اب تک چلی آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ راج دربار کی ہو ہو نقل ہیں۔ اس کے برخلاف کمبوڈیا کی تہذیب ہندوستانی ہے۔ کمبوڈیا ان ہندو ریاستوں میں سے آخری ریاست ہے جو کسی زمانہ میں اس سارے علاقہ پر حکومت کرتی تھیں اور اس کی راج ریتیں جو نری ہندو ہیں پانچویں صدی عیسوی سے چلی آرہی ہیں۔

ہند چین کے ساتھ ہندوستان کی دل چسپی صرف بچاؤ کے نقطہ نظر سے ہے۔ ہند چین ہی سنگاپور کا حفاظتی گڑھ ہے۔ کمران کھاڑی میں ایک ایسے سمندری اڈے بننے کی ساری قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں جس سے جنوبی چین کے سمندروں پر قابو رکھا جاسکے، اگرچہ ابھی اسے پوری طرح ترقی نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے ہندوستان کے بچاؤ کے لئے یہ ضروری ہے کہ یا تو کمران کھاڑی پر کسی ایسی طاقت کا قبضہ ہو جو پوری طرح ہندوستان کی دولت ہو یا پھر وہ کسی ایسی ریاست کے پاس ہو جو سمندری پھیلاؤ کی ہوس سے خالی ہو۔ اس لئے ہندوستان کا اپنا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ ہند چین کی خود اختیاری پر زور دے یا اس کے مختلف اجزاء کے کسی ایسے وفاق پر زور دے جو بدلی طاقتوں کی دخل اندازی سے محفوظ ہو، اور اگر ضرورت سمجھی جائے

تو کسی بین الاقوامی ادارے کی نگرانی اور رہتہام میں ہو۔

ڈیج مشرقی ہند

جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ملکوں میں ہندوستان کے دلی اور
ہندی تعلقات ڈیج مشرقی ہند کے ساتھ سب سے زیادہ گہرے
ہیں۔ وہاں کی تہذیب ہندوانہ ہے اور ہندو ہندوستان کے لئے
خاص کشش رکھتی ہے، دوسری طرف وہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمان ہے
اور مسلم ہندوستان اس کے ساتھ مذہبی لگاؤ رکھتا ہے۔ موجودہ
لڑائی نے ثابت کر دیا ہے کہ اس علاقہ پر کسی دشمن طاقت کا قبضہ
ہندوستان کی پوربی سرحدوں کے لئے سخت خطرناک ہے۔

ڈیج مشرقی ہند کی قدرتی دولت غرب المثل ہے۔ موجودہ لڑائی
سے ڈیج حکومت کو یہ سبق لینا چاہئے کہ جب تک وہ یہاں کی دیسی آبادی
کو حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں مدد نہ دے گی وہ اپنے ملک
اور اس کی قدرتی دولت کی حفاظت کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔
اس ملک میں قومی تحریک خاصی زوردار ہے اور جنگ کے بعد
ہندوستان کی طرف سے اس کی ہمدردی اور تائید ضرور ہوگی۔
ڈیج مشرقی جزائر ہند کے باشندوں کے ساتھ ڈیج حکومت کے
تعلقات آئندہ جو کچھ بھی ہوں اتنی بات ضرور ہے کہ ہندوستان
کسی مخالف یا سامراجی طاقت کو۔ خواہ وہ پوربی ہو یا چھپی۔ آئندہ
ڈیج مشرقی جزائر ہند میں قدم جمانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔
اس ملک کا مستقبل ہندوستان کے لئے بھی اتنا ہی اہم ہے
جتنا کہ آسٹریلیا کے لئے اور ان دونوں ملکوں کو چاہئے کہ

آپس میں مل کر اس علاقہ کے متعلق ایک مشترکہ پالیسی بنالیں۔

یہ ہیں ہندوستان کے وہ خاص خاص مفادات جو ان ملکوں سے وابستہ ہیں۔ اس پورے علاقہ کے ساتھ مجموعی طور پر ہندوستان کے جو مفادات وابستہ ہیں انہیں مختصراً کس طرح پیش کیا جائے؟ اس مختصر سی مدت کو چھوڑ کر جب کہ انگریزوں کے دلوں میں ایک طرح کا خوف، اور وہ بھی بے جا خوف، موجود تھا کہ کہیں فرانس اپنے ہندوستانی مقبوضات کو اڑنے کے طور پر استعمال کر کے اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کی کوشش نہ کرے جو اسے ہندوستان میں ایک صدی پہلے کھانی پڑی تھی ہندوستان کے مشرقی پڑوسیوں کے مسئلہ پر، بہ نسبت اس کے مغربی ہمسایوں کے بہت کم توجہ کی گئی۔ اب تک سرکار ہند کو اپنی مشرقی سرحد کے اس پار ملکوں کے ساتھ کسی قسم کی دل چسپی نہیں تھی، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے ہمسایوں سے کوئی خطرہ نہ تھا، اور ان سے ساز باز کرنے والی کوئی بڑی دولت بھی ان کی پشت پر موجود نہ تھی ہندوستان اور چین کے درمیان اور سیام اور برما کے درمیان پہاڑوں کی موجودگی، سنگاپور میں جاپان کو روکنے کے لئے سمندری آڑ، اور اس طویل المدت منصوبہ بندی اور جنگی کی طرف سے کامل بے توجہی جو جاپان کی دست درازی سے پہلے جاری تھی۔ ان سب باتوں نے سرکار ہند کو بالکل بے فکر اور نچت بنا دیا تھا۔ اپنے محفوظ ہونے کے بارے میں سرکار ہند کا یہ یقین کتنا گہرا تھا، اور کتنی دیر تک باقی رہا اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب انڈیا-برما (ہند-برمی) ریلوے بنانے کا سوال زیر غور آیا۔ تو اس کے خلاف فیصلہ کیا گیا۔

لیکن اب آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ۱۹۱۷ء کے وسط میں جاپان کے ہاتھوں ہندوستانی کی تسخیر ہی کی وجہ سے چھ مہینے بعد سیام ہاتھ سے نکل گیا اور ان دونوں کے ہاتھ سے جاتے رہتے کی وجہ سے ملایا کا سقوط ہوا، اور برما کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے ہندوستان کو ایسا شدید خطرہ درپیش ہو گیا جو ایک صدی کے اندر نہ ہوا تھا۔ جاپان کی فوج اور بیڑے نے اب شکی مزاج سے شکی مزاج شخص کو بھی یہ جتا دیا ہے کہ ہندوستان کا مفاد کس چیز میں ہے۔

اس لڑائی کے خاتمہ پر جاپان کو ضرور شکست ہوگی اور اس کی سامراجی جدوجہد اگر بالکل ناممکن نہیں تو خلاف قیاس ضرور ہو جائے گی۔ کیا اس وقت ہندوستان اپنے کو خطرے میں ڈالے بغیر پھر اپنی پرانی بے پروائی اور بے تعلقی کی پالیسی پر عمل کر سکے گا؟ اس سلسلہ میں ہمیں اس مکان کا قصہ یاد رکھنا چاہئے جس میں سے اگر ایک بھوت نکال باہر کیا جاتا تھا تو سات اس سے بھی بدتر بھوت اندر داخل ہو جاتے تھے۔ کچھ اور طاقتیں بھی اس علاقہ کے مستقبل کے ساتھ دل چسپی ظاہر کر رہی ہیں، اور اگرچہ ان کی پالیسی اب تک کسی قدر ڈھلھل اور غیر یقینی ہے لیکن ان کا رخ ایسا ہے کہ اگر ان کی تائید پر قوت موجود ہو جائے تو وہ ہندوستان کے لئے کسی قدر پریشان کن بن جائیں گی۔ ہندوستان کی حفاظت کا تقاضہ ہے کہ پہلے اس علاقہ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے اور اس علاقہ کی حفاظت کے لئے ہندوستان، آسٹریلیا، اور سلطنت متحدہ میں گہرے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اس اشتراک عمل کی ایک مناسب صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں ایک علاقہ واری تنظیم قائم کی جائے۔

چین کے اس پار امریکہ موجود ہے جو جنوب مشرقی ایشیا کی آئندہ حفاظت کے ساتھ دل چسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ امریکہ کی اپنی پالیسی غیر یقینی ہوئے تنہا پسندی کی پالیسی کی طرف عود کر کے ممکن ہے کہ امریکہ جنوب مشرقی ایشیا کی حفاظت میں عملی طور پر شرکت نہ کرے، لیکن اگر امریکہ کو دنیا کے کسی حصہ کے ساتھ دل چسپی ہو سکتی ہے تو وہ حصہ پیسفک سمندر (دھرا کاہل) کا ہے، اور اگر یہ دل چسپی پیدا ہوئی تو اس کی وجہ تجارت اور کاروبار اور خاص طور پر اس علاقہ میں امریکہ کی حیثیت کو محفوظ اور مضبوط بنانے کی خواہش ہوگی۔ ہندوستان کو امریکہ پر بھروسہ ہے اور اسے امریکی غلبہ کے ہوئے کا کوئی ڈر نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی یہ کہنا کہ اگر امریکہ ان دوسری طاقتوں کی بہت افزائی کرے جو پاؤں پھیلا کر اس علاقہ میں مداخلت لے جا کر ناچا ہتی ہیں تو بھی ہندوستان کو کسی قسم کا خوف و ہراس نہ ہوگا۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی طرح اس علاقہ کی سفارتی مصلحتیں بھی آگے چل کر سرد خن ہوں گی، یعنی امریکہ، چین اور ہندوستان (برطانوی دولت مشترکہ کے اندر رکھ کر) یہ تینوں خاص خاص شریک کار ہوں گے۔ لیکن ہندوستان اب زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتا۔

اسے مشرق میں بھی اپنی حیثیت اتنی ہی با اثر بنالینی چاہئے جتنی کہ مغرب میں ایران اور افغانستان میں ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس پورے علاقہ میں ہندوستان کی سفارتی نمایندگی کا انتظام کیا جائے۔ اس علاقہ کے ساتھ ہندوستان کا جو اہم مفاد وابستہ ہے اس میں ہندوستان، نیز باہر کے ملکوں کو خاص دل چسپی ہے، اور کوئی

چھٹا باب

چین، روس اور امریکہ

پچھلے باب میں جن مسئلوں پر بحث کی گئی ہے اگر ان کا مقابلہ ان زبردست مسائل سے کیا جائے کہ آنے والی دنیا پر جن طاقتوں کی حکمرانی مقدر ہو چکی ہے ان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کیا ہونے چاہئیں تو معلوم ہو گا کہ پچھلے باب کے مسائل بالکل محدود اور مقامی نوعیت کے تھے۔ ان دیوپیکر طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی ترتیب ہندوستان کے لئے از بس لازمی ہے ان کے ساتھ اشتراک عمل کے طریقہ کا تعین اتنا اہم سوال ہے کہ شاید اس سے زیادہ اہم اور نازک مسئلہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے پورے احاطہ میں مشکل ہی سے ملے گا۔ آئیے اب ان واقعات کی چھان بین کریں جن کی بنا پر ان سلطنتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ہندوستان کے رویہ کا تعین ہو گا۔

چین

ہندوستان اور چین کی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ دونوں کثیر آبادی رکھتے ہیں۔ ان کی ملی جلی آبادی دنیا کی کل آبادی کا چھٹھ

ہے۔ لڑائی کے بعد دونوں ملکوں کو تعمیر جدید کے بڑے پیمانے کے پروگرام بنانا ہوں گے۔ دونوں ملکوں کی تاریخ اندرونی اختلافات سے پڑھے۔ دونوں کے مابین نظام میں زراعت غالب ہے۔ اور اب دونوں ایک مشترکہ دشمن یعنی جاپان کا سامنا کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کا کلچر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے پھر بھی ایک کا اثر دوسرے پر پڑا ہے۔ ہندوستان بدھ مت کی جنم بھومی ہے جو چین کے نمایاں مذہبوں میں سے ہے۔ چینی مسلمانوں نے چینی کلچر اور چینی تصوراتی نظام کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ گزشتہ صدی میں دونوں ملکوں کو مغربی خیالات کے تصادم کے ساتھ تطابق کرنا پڑا ہے، اور دونوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کی نئی نسلیں مغربی تہذیب کی تمام اچھی باتوں کو اپنے اندر سمولیں، لیکن اپنی روایتوں سے بالکل دست بردار نہ ہو جائیں۔

ہندوستان اور چین دونوں کبھی کسی بڑے جھگڑے میں نہیں آجھے ہیں۔ جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تو ہندوستان ہی سب سے پہلا ملک تھا جس نے ایک غیر سرکاری طبی وفد بھیج کر چین کے ساتھ اپنی علمی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور وہ بھی اس وقت جب کہ مغربی طاقتیں ہنوز جاپان کو راضی رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھیں۔ موجودہ لڑائی میں چینی اور ہندوستانی فوجیں شانہ بہ شانہ لڑی ہیں۔ ہندوستان چین کو ہوائی اور خشکی کے راستہ رسد بھیجنے کا مرکز بن گیا ہے۔ تبت اور برما کے اندر سے نئی شاہراہیں کھولی جا چکی ہیں اور چین کو جانے والی موجودہ ڈاک کی سڑک جو گلگت اور سنک یا نگ ہو کر جاتی ہے، ہندوستان کے اندر سے گزرتی ہے چینی طلباء تعلیم اور تربیت کی غرض سے ہماری یونیورسٹیوں میں آئے ہیں،

اسی طرح سے ہندوستانی طلباء چین بھیجے جا چکے ہیں۔

مقاصد اور نصب العین کی یہ ہم آہنگی ان دونوں ملکوں کے درمیان پائیدار رشتہ دوستی قائم کرنے میں بنیاد کا کام دے سکتی ہے۔ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کے لئے چین سے تجارت کرنے میں اور اس ملک کو صنعتی بنانے میں امداد دینے کے نئے مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ چین اور ہندوستان آپس میں بل جمل کر ایشیاء کی حفاظت کے لئے ایک مشترکہ منصوبہ بنائیں۔ دونوں ملکوں کی اس ہم آہنگی سے فوجوں میں کفایت ہوگی۔ ان دونوں ملکوں کے مدبروں کا یہ کام ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کریں کہ آپس کے بعض اختلافی مسائل مثلاً تبت کا مسئلہ، سنک یا ٹنگ کی تجارت اور جنوب مشرقی ایشیا میں ہندوستان کے ہمسایوں کی خود مختاری یہ چین اور ہندوستان کے درمیان اس تعاون میں حائل نہ ہوں جو امن عالم کے لئے ازلیں ضروری ہے۔

روس

جنگ سے پہلے روس ہندوستان کے لئے ایک سرہستہ راز تھا، اگرچہ ہندوستان کی آبادی کے بعض حصے تصوراتی حیثیت سے روسی افکار اور خیالات کی طرف مائل تھے، لیکن عام طور پر مغربی ملکوں کی طرح ہندوستان کے لئے بھی روس ایک بھیدا اور مٹا تھا۔ جرمنی کے روس پر حملہ کرنے سے یہ پردہ راز اٹھ گیا۔ روسیوں نے جس پامردی سے جرمن مار دھاڑ کا مقابلہ کیا، پوری قوم اسٹالن کے گرد جمع ہو گئی اور روس کے سر باشندے نے زیادہ سے زیادہ قربانی سے دریغ نہ کر کے پہلے جرمن یلغار کو روکا

اور پھر اسے پہچانی میں تبدیل کر دیا۔ ان سب باتوں نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں۔ اب ہماری سمجھ میں آتا جا رہا ہے کہ پچھلے ۲۵ برس میں روس نے اکثر ایسے مسئلوں کو جو آج بھی ہندوستان میں نازک ترین مسئلے بنے ہوئے ہیں کس طرح حل کیا۔ ان میں سے خاص خاص مسائل یہ ہیں:- خواندگی کی اشاعت، رہائش، غذا اور حفظان صحت کے انتظامات، صنعتی ترقی، زراعت اور صنعت کا توازن، اور مختلف علاقوں کے مقامی قومی گروہوں کا ایک مرتب شکل میں اس طرح انضمام کہ ساتھ ہی ان میں سے ہر ایک کی ثقافتی وحدت بھی قائم رہ سکے ان تمام باتوں نے سویت تصوراتی نظام میں ایسی جاذبیت پیدا کر دی ہے کہ اس کا اثر اس ملک کی اندرونی سیاست پر ضرور پڑ کر رہیگا۔ اب تک ہندوستان میں گروہوں کی تقسیم مذہبی اور سماجی اختلافات کی بنا پر ہوتی آتی ہے۔ لیکن اب اور خاصہ کہ نئی نسل میں یہ تقسیم تصوراتی بنیادوں پر ہوتی جا رہی ہے۔

ان باتوں کے باوجود، اور باوصف اس امر کے کہ روس اور ہندوستان کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں اور ہندوستان نے روس کو جنگی ذخائر بھیجنے میں نمایاں حصہ لیا ہے، روس کے حالات زندگی اور نظم معیشت کی تفصیلات کے بارے میں اب تک یہاں ناواقفیت بدستور باقی ہے۔ اسی طرح 'معلوم' ہوتا ہے کہ روس کو بھی ہندوستان کے اصلی حالات کے بارے میں کوئی واضح علم نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ تبادلہ معلومات اور بہتر مفاہمت پیدا کرنے کے سلسلے میں ابھی دونوں ملکوں میں بہت کچھ کام ہونا باقی ہے۔

جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو فضائی سفر کی وہ زبردست ترقیاں جو روس میں ہوئی ہیں تجارتی اور زمانہ امن کے اغراض کے لئے استعمال ہونگی طویل اور عریض روسی علاقوں میں بڑی بڑی ہوائی لائنیں کام کرنا شروع

کر دیں گی۔ اگر روس اپنی تجارتی ہوائی لائنوں کو جنوب کی طرف پھیلانے کا
تصفیہ کرے تو اس سے ہندوستان کو بھی موقع ملے گا کہ وہ اپنی تجارتی
لائنیں روس کے تجارتی مرکزوں تک لے جائے۔ اس طرح دونوں ملکوں کے
لئے تجارتی ہوا بازی اور باہمی تجارت کے لئے زبردست شاہراہیں کھل
جائیں گی، کم از کم بقیہ ایشیاء کی تجارت میں دونوں کو دل چسپی رہے گی۔
شمالی ایشیاء میں روس کی نگرانی میں حفاظتی اغراض کے لئے جوائنٹلٹات
بھی کئے جائیں گے ان کی بنا پر جنوبی ایشیاء کے لئے بھی ویسے ہی انتظامات
زیرِ فکر یا بروئے کار آئیں گے اور ان کا خاص مرکز یہ ملک (ہندوستان)
ہی ہوگا۔ مشرق وسطے اور اٹھانستان میں جو کچھ سفارتی پالیسی روس کی ہوگی
اس کے جواب میں اور ویسی ہی مشترکہ ہندوستان کی اور انگریزی پالیسی بھی
ان علاقوں میں ہوگی اور پھر امریکہ کے مفادات بھی ان ملکوں کے ساتھ ضرور
وابستہ ہوں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان ملکوں کے درمیان جو ہم آہنگی
اور تامل میل لڑائی کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے وہ امن کے زمانہ میں بھی جاری رہے گا
روس کے ساتھ برطانیہ کا ۲۰ سالہ معاہدہ دوستی ہندوستان پر بھی
عائد ہوتا ہے، غرض کہ ہندوستان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس زبردست
ہمسایہ (روس) میں روز افزوں دل چسپی لے، ان دونوں ملکوں کی دوستی
عرصہ دراز تک ایشیاء کی حفاظت کا ایک اہم عنصر بنی رہے گی۔

امریکہ

خود امریکی اس بات کے تسلیم کرنے میں دوسروں سے پیش پیش
ہیں کہ ان کے ملک کی خارجہ پالیسی تضاد سے خالی نہیں ہے، سچ ماٹام عالم

پر امریکہ کا اثر بہت گہرا اور زبردست ہے۔ اگرچہ امریکی روایات شنشہیت
 کے خلاف ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ امریکی علاقوں کے بڑے
 بڑے حصے جن طریقوں سے حاصل کئے گئے وہ پرانی سامراجی طاقتوں
 کے طریقوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ فلپائنز
 کا مسئلہ بھی خوشگوار طریقہ پر طے ہوتا ہے یا نہیں، دوسری طرف امریکہ
 کی خارجہ پالیسی کے بعض رائے کاریہ کہہ رہے ہیں کہ جو جزیرے اس
 لڑائی میں امریکہ کے ہاتھ آئے ہیں انہیں چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ ساری
 دنیا میں ہوائی اور بحری اڈے حاصل کرنے چاہئیں، ایشیائی اقوام کے
 دلوں میں امریکہ کے حریت پسندانہ خیالات اور ان کے علم برداروں
 مثلاً لنکن کی بڑی وقعت ہے انہی خیالات پر امریکہ کے حیرت انگیز
 سیاسی ڈھچر کی بنیادیں رکھی گئی ہیں، لیکن مقام تعجب ہے کہ ان حریت
 پسندانہ خیالات کے باوجود امریکہ کے باہر کے ملکوں، مثلاً فلسطین میں
 امریکی پالیسی ایک دوسرے ہی رنگ میں نظر آتی ہے۔ یہ کتنا غالباً کچھ
 زیادہ ناروا نہ ہو گا کہ امریکی حریت پسندی میں امریکی اقتصادی طریقوں
 کا کچھ نہ کچھ شائبہ ہمیشہ رہا ہے۔ جن ملکوں میں امریکی سرمایہ دارانہ
 جدوجہد کا زور ہے اور اس کا جو اثر ان کی اقتصادی حالت پر پڑا ہے
 اسے دیکھ کر بعض اوقات ایشیاء والوں کے دلوں میں امریکییت کے
 پورے فلسفہ کی طرف سے ایک طرح کا خطرہ اور دوسو سو پیدا ہو جاتا ہے۔
 جاپان کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کی تاریخ پر غور کیجئے تو اس
 میں بھی ایک طرح کا تضاد نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جاپانیوں کو جنگی
 تیاریوں کے لئے ساز و سامان امریکہ ہی سے ملا اس لئے کہ امریکہ کے

بڑے بڑے بیوپاریوں کا قائدہ اسی میں تھا اور پل ہاربر کے واقعہ تک امریکہ نے جاپان کو ناکارہ ٹوہے کے ٹکڑے بھیجا بند نہ کیا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ جنگ کے بعد کی دنیا میں عالمگیر امن اور خوش حالی پیدا کرنے کا جو مصمم ارادہ امریکہ کر چکا ہے۔ اس کا اتنا اثر ضرور ہوگا کہ ایشیا والوں کو نقصان پہنچا کر اپنا قائدہ کرنے کی خواہش دب جائے گی، لیکن ایک سہمی ہوئی دنیا کو مزید اطمینان دلانے کی ضرورت ہے۔ ابھی چند دن کی بات ہے کہ ایک ممتاز ہندوستانی مدبر نے ممبئی میں ایک تقریر کی جس میں انہوں نے اٹلانٹک چارٹر کو ایک بڑے اٹلانٹک لائٹر سے تشبیہ دی جس میں پہلے درجہ، دوسرے درجہ تیسرے درجہ اور چوتھے درجہ کے مسافر ہوتے ہیں۔ مقرر کا منشا یہ تھا کہ مشرق کے لوگ جس درجہ میں رکھے جاتے ہیں وہ ان درجوں سے بہت کچھ مختلف ہے جو بڑی بڑی یورپی طاقتوں نے اپنے لئے محفوظ کر رکھے ہیں۔ ابھی حال میں وہ مراسلت منظر عام پر آئی ہے جس میں صدر امریکہ کو ان کے ذاتی نمائندہ مقیم ہندوستان نے ہندوستان کی آزادی کے بارے میں پرزور الفاظ میں متوجہ کیا تھا۔ ہندوستانی قدرتی طور پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ ان کے ملک کی آزادی ایک ایسی چیز ہے جس کی تائید آزادی کی خاطر ہونا چاہئے لیکن یہ دیکھ کر کہ ان کی آزادی پر زور اس وجہ سے نہیں دیا یا رہا کہ وہ آزادی کے مستحق ہیں بلکہ محض اس لئے کہ اس سے امریکہ کو جاپان کے خلاف جنگ کرنے میں مدد ملے گی ان کے دلوں میں فخر اور اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستانی چاہتے ہیں کہ امریکہ والوں

بڑی قسم کے امریکی مسافر جواز اٹلانٹک میں چلتے ہیں ۱۲

کی طرف سے ان کے احساسات اور جذبات جس حد تک ممکن ہو گرم دلی اور خلوص پر مبنی ہوں لیکن یہ احساسات صرف اسی صورت میں بڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اس ہندوستانی سپاہی کو جو متحدہ اقوام کی خاطر اور جنگ کے بعد اپنے ملک کی آزادی کے لئے اپنا خون بہا رہا ہے کرایہ کا ٹکڑا کھانا انتہائی ناز و ادا اور نازیبا ہے جتنا کہ ان ”چار آزادیوں“ کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنا جو امریکہ والوں نے دنیا کو پیش کی ہیں۔

ہندوستان ایک غریب ملک ہے، اسے اپنے معیار زندگی بڑھانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ لڑائی اسے بہت ہنگامی پڑی ہے اور اس کے باشندوں کو امریکہ کے باشندوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں اگر ان تمام قربانیوں کے باوجود دنیا کی سیاسی اور اقتصادی تنظیم جدید میں ہندوستان کو اس کا واجبی حصہ دیا جائے گا تو اس سے یہ امید کیونکر کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک اچھے ہمسایہ کا حق جوش اور سرگرمی کے ساتھ ادا کرے؟

امریکہ کے بارے میں ایک عام ہندوستانی کے خیالات اور توقعات کی جو تصویر مذکورہ بالا فقرات میں کھینچی گئی ہے اس کے خدوخال شاید پست اور ادنیٰ درجہ کے نظر آئیں، لیکن یہ تصویر مکمل نہیں ہے، اس لئے کہ ہندوستانی یہ جانتے ہیں کہ امریکا اندرونی سیاسیات اتنی الجھی ہوئی ہیں کہ جو کچھ امریکی اخبارات میں لکھا ہوتا ہے وہ پورے ملک کی رائے یا امریکہ والوں کی تہذیب اور مخیر المزاجی کی پوری طرح ترجمانی نہیں کرتا۔ اس لئے جب کسی ہندوستانی کو اخبار میں کوئی اس

قسم کا بیان نظر آتا ہے جو امریکہ کی ایک مشہور شخصیت نے دیا تھا کہ امریکہ لڑائی میں اس لئے نہیں شریک ہوا ہے کہ وہ ہر جیشتی کو دو دھکا کا ایک گلاس پلائے، تو اسے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوتا۔ امریکہ کے باشندے دنیا میں سب سے زیادہ فیاض، نیک دل اور همان تواریز ہیں۔ وہ شان کی نہیں لیتے اور ہر سیلح ایشیائیوں کے ساتھ ان کے اخلاق اور خیر سگالی کو پوری مالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر پاتا ہے۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کو دراصل ہندوستان کے

ساتھ کوئی دل چسپی نہیں ہے اور امریکہ کے لوگ ہندوستانی مسئلہ کی بحث یا تو انگریزوں کو پریشان کرے یا پھر کسی انتخابی مہم میں کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں ہندوستان کو تو قہر ہے کہ یہ بیان صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ امریکہ ساری دنیا کو اور خصوصاً ہندوستان کو حریت پسندانہ خیالات، تعلیم، زراعت اور مادی صنعت کاری کے بارے میں بہت کچھ نئی باتیں سکھا سکتا ہے۔ سیاسی حیثیت سے بھی امریکہ کے ساتھ روابط قائم رکھنا ہندوستان کے لئے مفید ہے۔ باشندوں کے ایک بے ربط اور داخل بے جوڑ مجموعے کو لیکر اور اس کے مختلف اجزاء کو سمو کر ایک قوم بنا دینا۔ یہ امریکہ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہندوستان کے لئے ہمیشہ مشعل راہ بنا رہیگا۔ بلا امتیاز نسل، عقائد یا مذہب ہر امریکی شہری کو اس بات کی آزادی حاصل ہونا کہ وہ اپنے ملک کے صدر بننے کی آرزو کر سکے۔ اس میں بھی ہندوستانیوں کے لئے ایک سبق پوشیدہ ہے۔

ساتواں باب

ہندوستان، برطانوی دولت مشترکہ

اُردو

دنیا

ہندوستان اور انگلستان کا جوگ ہو چکا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مشیت الہی کہنے یا تاریخی حالات کی منطق لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کا ساتھ ان دونوں ملکوں کے لئے مفید ہو چکا ہے۔ ان دونوں کو اس ساتھ کی ضرورت ہے اور دنیاوی نظام کو ان دونوں کی ضرورت ہے۔ اسی نقطہ نظر کی روشنی میں اور ایک عالم گیر پس منظر کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان اور انگلستان کی شراکت یا اتحاد یا ایک پیشین آئندہ اور پائدار چیز ہے۔

اگر ہم ان فائدے کے سارے رجحان اور افسانہ اور اس کی دنیا کے درمیان روز افزوں وحدت پر غور کریں تو وہ نتیجہ جو اوپر بیان ہوا لازمی اور لا بد نظر آتا ہے۔ اگر ایک طرف ریڈیو اور ہوا بازی سے ساری دنیا کے ربط و ضبط کو آسان اور فوری بنا دیا ہے تو دوسری طرف نجات اور آزادی کی جنگوں سے گزرتا ہوا ایک عالمی ریاست کا درخشاں نصب العین بھی انسانِ افق پر نظر آ رہا ہے۔ غرض انسانِ اعلیٰ انسانِ برحق

اور اس کا شاہد مستقبل برابر رو بہ ترقی ہے ۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ترقی کے یہ مدارج صاف طور پر نظر آتے ہیں، ہندو مسلم ہندوستان، برطانوی دولت مشترکہ کی منزل سے ہو کر انسانی دولت مشترکہ کی طرف بڑھ رہا ہے، مگر عام طور پر ساری دنیا کی حالت پر غور کیجئے تو نظر آتا ہے کہ قبیلہ داری و حدتوں سے ترقی کر کے انسان ”متحدہ اقوام“ کی بلندی تک جا پہنچا ہے۔ تاریخ عالم اب تک اتنی زبردست شیرازہ بندی کی نظیریں پیش کر سکتی، اور آج انسان ایک عہد آفرین تبدیلی کی چوکھٹ پر کھڑا ہے ۔

لیکن یہ یاد رکھئے کہ ہر عبوری دور میں متغیض حالات کی بھرمار ہو کر رہتی ہے۔ یورپ میں وہ ملک جو پہلے حدتوں کی حیثیت رکھتے تھے ”خود اختیاری“ کے اصول کے آگے سر تسلیم خم کر کے اب چھوٹی چھوٹی باقتدار ریاستوں میں منقسم ہو گئے ہیں عہد نامہ ورسائی نے استیلٹوں کے مسئلہ کو ایک اہم سیاسی مسئلہ بنا دیا تھا، لیکن قومی خود اختیاری کے اصول نے اسے حل کرنے میں کچھ زیادہ مدد نہ دی۔ خراب سیاسیات اور اس سے بھی بدتر اقتصادیات نے نئی پرانی سب ریاستوں کو پھر سے غلغلا کی حالت میں ڈال دیا ہے، اور معاہدہ ورسائی نے جس یورپ کو جنم دیا وہ مخالفت کی اس پس بھری فضا کو صاف کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اکثر ارباب فکرمندیوں سے سمجھے بیٹھے تھے کہ موجودہ جنگ ضرور ہو کر رہے گی:

اُس وقت کی طرح اب بھی یورپ جس منزل پر پہنچ گیا ہے وہاں صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ اور شاید اس سے پہلے یورپ کی تاریخ میں کبھی یہ چیز اتنی صاف نظر نہیں آئی۔ کہ اب اس کے

سانے صرف دو انجام ہیں جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں،
یعنی یا تو وہ بے مکان ایک نئی جنگ کی منزل کی طرف بڑے یا پھر
اپنے بے جا غصہ، تعصب اور جھوٹا نرجوش و خروش پر قابو پا کر امن
کی پائیدار تنظیم کی کوشش کرے۔ انسانی روح کے پاس
ان دونوں صورتوں کے لئے مادی قوت موجود ہے۔ سائنس
اپنی روزانہ زندگیوں معجزاتیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہاتھ
باندھے کھڑی ہے، اب ہم چاہیں اس سے بنائے کا کام لیں
یا بگاڑنے کا۔ سائنس کی مدد سے ہم اگر چاہیں تو تہذیب کی اینٹ
سے اینٹ بنا سکتے ہیں یا پھر دوسری طرف فردانی اور خوشحالی
کا ایک ایسا دور شروع کر سکتے ہیں جس کی نظیر انسان نے مشکل
ہی سے دیکھی ہوگی۔ بہر حال جنگ نے ہمارے لئے ایک بہت
بڑا ترکہ چھوڑا ہے۔ اور سردست یورپ کا اخلاقی اتحاد پارہ پارہ
ہو چکا ہے۔

یہ صورت حالات افسوس ناک ہے اور نازک بھی لیکن یہی تو تہذیب یورپ کا
معنا ہے انسان اپنے باہر قدرت پر جتنا قابو پاتا جا رہا ہے اتنی ہی اپنے اندر
خود اپنی فطرت پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ سمندر کی دگو
کھنگالتا اور ستاروں کی دنیا پر ہاتھ مارتا ہے لیکن انسانوں کے دلوں تک
رسائی اس کی دسترس سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ اس کی ساری حد نظر پر
ایک افسوس ناک حد تک مادیت چھائی ہے۔ وہ سطحی چیزوں کے پیچھے بے مکان
بھاگتا اور اپنی عقل کے پر تو سے انھیں بھڑک دار بناتا چلا جا رہا ہے۔ وہ محبت
کو ایک مبہم نصب العین کہہ کر اس کا مذاق اڑاتا ہے اور مذہب کو بس بنا پر

زور دے دیتا ہے کہ اس پر سائنس کی مہر تصدیق ثبت نہیں ہے۔ غرض کہ اسی طرح ایک المناک جوش و خروش کے ساتھ وہ سیاسیات اور اقتصادیات کی پستیوں کے گڑھوں سے تیار کرتا ہے جو بڑے ہی بگڑ جاتے ہیں۔ اس کی نظر میں ہر غیر مادی چیز فی اہم ہے، اس لئے جب کبھی وہ کوئی معاہدہ اتحاد کرتا ہے تو پہلے مفادات پیدا کر دیتا ہے کیونکہ اس چیز کے بارے میں جسے وہ لائابالی پن سے انسانی کمزوری کہتا ہے اس کا مبلغ علم بس اسی قدر ہے۔ مفادات کی حصہ داری پامنا رہ نہیں سکتی، نسبت نصب العین کی حصہ داری دیر پا ہوتی ہے لیکن سیاسیات میں نصیبین کی پروا کون کرتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر صلح جنگوں کے درمیان کا ایک وقفہ بن جاتی ہے۔

ایسے اصحاب فکر موجود ہیں جنہیں اس میں بہت کچھ شک ہے کہ اگر سشتہ بنام عظیم جمہوریت کو بچانے کے لئے لڑی گئی تھی۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں صلح کے بہت تھوڑے عرصہ کے اندر ہی اندر نازیست فسطائیت اور اشتراکیت سب کے سب نے پرانی جمہوریت کے خلاف علی احتجاج کا جامہ پہن کر اس پر دھاوا بول دیا تھا، خود بین الاقوامیت بھی الجھنوں سے خالی نہ تھی۔ کسی چھوٹی چھوٹی نئی نئی ریاستوں کے قیام نے انتشار کو اور بڑھا دیا تھا۔ یہ ریاستیں قومی خود اختیاری کے اس کتابی اصول پر قائم کی گئی تھیں کہ ہر قوم کو ایک ریاست بنانے کا حق پہنچتا ہے اور ان کے قیام میں فوجی اور اقتصادی حفاظت کا ذرا بھی لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہندوستان میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو یورپ کے حشر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور پھر بھی اسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں اور تناہیں سوچے کہ یہی حشر آسانی سے ہندوستان کا بھی ہو سکتا ہے۔ غیر محدود، یا کم از کم غیر محدود اور غیر منظم قومی اقتدار کا اصول اب ہمیشہ کے

لے مٹ چکے۔ اور تا وقت کہ ممکنہ اور وسیع ترین پیمانے پر بین الاقوامی تعاون ہو، جنگ کے بعد کی نئی دنیا کا مستقبل پرانی دنیا سے بھی زیادہ تاریک بن جائے گا۔ مطلق خود اختیاری میں انتشار کی قوتیں مضمر ہوتی ہیں، ۱۹۳۹ء کی جنگ واصل انہی کا نتیجہ تھی۔ پچھلی غلطیاں ہمیں کتنی بھی مہنگی پڑی ہوں، لیکن اگر ان خوفناک تجربوں کے بعد اب بھی ایک سچا بین الاقوامی نظام پیدا ہو جائے تو ان سب کی تلافی ہو جائے گی۔

امن کی منصوبہ بندی کی قیادت اتحادیوں ہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن اگر ان کی نظریں صرف یورپ اور امریکہ ہی پر جمی رہیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ یہ لڑائی جیتنے کے بعد بھی صلح ہار جائیں۔ اگر وہ گورے رنگ والی دنیا سے بالاتر نہ ہوئے تو جو نظام وہ بنائیں گے وہ عالمی نظام کے بجائے کوئی دوسری ہی چیز ہوگا۔ یورپی تہذیب کی قوتوں کے نمائندوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر انھوں نے یورپی نظام کو بقیہ دنیا کے سر منڈھا تو وہ کسی طرح بھی عالمی نظام نہ کہا جاسکے گا، اور جب تک کہ ایک حقیقی عالمی نظام قائم نہ ہو یورپ کو جنگ سے ہٹکا نہیں نہ ہوگا۔ یورپ اور امریکہ کو یہ حق بے شک پہنچتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی وحدت کو قائم رکھیں، لیکن یہ چیز الگ تھلگ رہ کر نہیں بلکہ انسانی آزادی کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے ہونی چاہئے اور آزادی کا تقاضا ہے مساوات۔ کیا یورپی نظام کی قوت محکمہ یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ذریعہ غیر یورپی ممالک سے ناجائز طریقہ پر فائدہ اٹھایا جاسکے گا؟ بین الاقوامی سیاسیات کے ایک مشہور راستے کا رد کا افسوس ملاحظہ ہو:-

یورپی ممالک نے بڑی حماقت کی کہ ایک دوسرے سے لڑ پڑے
وہ اگر چاہتے تو ایشیا اور افریقہ میں برابر پھیلتے رہتے اور

اس سے ان کی بڑھتی ہوئی خوش حالی قانع اور ان کی سماجی ترکیب برقرار رہتی۔

اگر یورپی نظام کی بنیادیں اسی منطق پر رکھی جلتے والی ہیں تو شاید جب تک ایسا نظام قائم رہے گا یورپ طاقتوں کا جسم بنا رہے گا۔ جب تک کوئی غالب طاقت موجود ہے امن نہیں ہو سکتا، اس لئے غلبہ کی نفسیات ہی امن کے خلاف ہے۔ ایک سچی اور ترکیبی عالمی جماعت صرف اس صورت میں وجود میں آسکتی ہے جب کہ ترقی یافتہ اور پست تمام باشندگان عالم کے مشترکہ مسئلہ کو صاف طور پر سمجھ لیا جائے۔

پہلی اگست ۱۸۹۰ء کو جو اعلان کیا گیا تھا وہ صرف فرانسیسی حقوق کے بارے میں نہیں بلکہ حقوق انسانی کے متعلق تھا۔ اس کے بعد دو سراہم فرانسیسی انقلاب نیز جرمن انقلاب ۱۸۴۸ء میں ہوا، اور درمیانی مدت میں نیپولین کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان انقلابوں میں کچھ نئی قوموں نے جنم لیا۔ طرح طرح کی اور شدید قومی جنگیں شروع ہو گئیں۔ جن میں سے سب سے زیادہ مشہور لڑائیاں ہیں جو ۱۸۹۶ء اور ۱۹۱۴ء میں ہوئیں، یہاں تک کہ پہلے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک پہنچ گیا۔ اگر ایک طرف قومی جذبات اور قومی امنگوں نے انسان کی عظمت و دبا لاکردی تو دوسری طرف ان کی وجہ سے جنگ کے شعلے بھی برابر بھڑکے رہے۔ امن اور آزادی کے بارے میں انسان کی کوششیں بے شک بڑھیں، لیکن ساتھ ہی نفرت اور جنگیں بھی زیادہ ہوتی گئیں۔ ایجادات کی ترقی، وسائل نقل و حمل کی نشو و نما اور باہمی روابط کی وسعت کے ساتھ ساتھ ہر نئی جنگ سے قوموں کی زیادہ تعداد متاثر ہوتی

گئی اور جیسے جیسے قومیں لڑائی کے کشت و خون میں سے گزرتی گئیں ویسے ویسے ان کی قومیت پسندی بھی بڑھتی گئی مختلف قومی ریاستوں کے شہریوں کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہو گئیں جنہیں ”دفاعات“ کہا جاتا ہے۔ یعنی فوجیں، بڑے ہوائی فوج اور ناقابل تسخیر سرحدی مورچے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اور اندر ہی اندر بین الاقوامیت کا ڈھانچہ بھی تیار ہوتا گیا، کیونکہ آہستہ آہستہ ساری دنیا کے عام آدمیوں کے ذہن بنی نوع انسان کے ساتھ مشترکہ وفاداری کے سلسلے میں منسلک ہوتے گئے۔ امید ہے کہ اب ہم آئندہ قومیت کی ہیبت ناک لڑائیاں نہ دیکھیں گے۔

یہ سوال کہ کیا آج کل کی لڑائیاں عام طور پر مخالفت فلسفوں کے تصفیے کے لئے ہوتی ہیں ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو انہیں عہد متوسط کی مذہبی جھگوں کا ایک نیا چولا سمجھنا چاہیئے۔ اگر ہم نصب العینوں کے اختلاف کو دور کرنے کے لئے فوجوں ریزی کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں بھال سکتے تو ترقی کے متعلق ہمارے بلند بانگ دعوؤں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ان حالات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اب تک زور و طاقت کی سیاست کی بھول بھلیاں میں بھٹک رہے ہیں۔ محوری طاقتوں نے جب اپنا دور شروع کیا تو ان میں اور دوسروں میں تصوراتی اختلافات بہت کم تھے، لیکن وہ بہت جلد سائنٹی فک صنعتی تہذیب کے زہریلے اثر سے مغلوب ہو گئیں۔ مسیحیت یا مخالف مسیحیت اس تہذیب کا جو نہیں ہیں۔ اس کے عناصر توٹیں، تیل، ربڑ، پٹرول، زمین اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں۔ طاقت کی ہوس۔ جس میں دوسروں کا خیال نہیں ہوتا اور جو

اسی وجہ سے دست درازانہ ہوتی ہے۔ یہی دراصل لڑائی کی جڑ ہے۔

جنگ تمام تر تباہی اور بربادی کا نام نہیں ہے۔ اکثر اوقات بعض اخلاقی فرائض

ایسے ہوتے ہیں جو صرف جنگ ہی سے پورے ہو سکتے ہیں چنانچہ موجودہ جنگ بھی،

باوجود اس کے کہ اس کا دامن زور اور طاقت کی سیاست سے داغدار ہے،

ایک اہم اخلاقی پہلو رکھتی ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ محوریوں کی پس بھری

تخلیم جو تباہی اور بربادی کا کام کرنے کے لئے طلب کی گئی ہے حقوق انسانی

کو پامال کر رہی ہے۔ جو لوگ ان حقوق کو عزیز رکھتے ہیں ان کا سرخس یہ ہے کہ

ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تعمیر کی منزل کی طرف بڑھتے رہیں اور خون سے ہٹا

ہوئی زمین میں ایک پاک ترم دنیا کا بیج بویں۔ ٹھکرا اور اس کے نسل پرستی کے

عقیدے کی شکست کے بعد پہلے سے زیادہ انسانی اتحاد پیدا ہو سکے گا۔

جنگ کے اس پورے دھندے میں ہاری ہوئی قوموں کی طرح مغرب

کی فتح مند قوموں کو بھی اپنے گناہوں کا کفارہ دینا ہوگا، اور اس آئین میں

تینے کے بعد ان میں پہلے سے زیادہ شرافت کے جوہر پیدا ہو جائیں گے اور وہ پہلے

سے بہتر طریقہ پر انسانی خاندان کے گھربار کوئے سرے سے ترتیب دے سکیں گی۔

اسلمہ، کارکردگی اور سفارتی مصلحتوں کے جوہر آج کل کی دنیا نے

بنار کے ہیں وہ اپنے پرستاروں سے زبردست بھینٹ مانگ رہے ہیں۔ کوری

قومیں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی اور موت کی کش مکش میں گتھی ہوئی ہیں

اور کالی اور بھورے رنگ کی قومیں ان کی مدد کے لئے بلالی گئی ہیں۔ کارکردگی

اور ہند مند کی مختلف مجموعے مغرب کی وحدت کو پرانندہ کرتے ہیں ایک

دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام کر رہے ہیں۔ یورپ نے زور اور طاقت سے

کام لینے کے جو خطرناک صنایع بنائے تھے اب وہ خود ان کی زد میں گیا

ہے۔ مغرب مشرق جو سدا بدنام اور مطعون رہا ہے انھیں بھاڑ بھاڑ کر اس
اس نظر سے کو دیکھ رہا ہے اور دہی زبان میں پوچھتا ہے کہ جو کچھ سامنے
نظر آ رہا ہے کیا یہی عظمت و شرافت کی تصویر ہے۔ لیکن شاید اسی جنگ
کی بدولت اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ مشرق اور مغرب اپنی اپنی روایات
کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں اور اپنے اپنے افتاد اور معیار کا باہمی
تبادلہ کریں۔ امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ چین اور ہندوستان کی
سلطنت ایک نیک شگون ہے۔

۱۲۱؎ کا سبب کچھ بھی ہو، لیکن وہ اس بھائی کے ثبوت کی ایک مثال پیش کرتی
ہے کہ اکثر اوقات شرعی سے خیر پیدا ہوتا ہے۔ یورپ کا سفر صاف ہے کہ وہ اپنی
سائنس کی حدود کو تسلیم کر لے اور "نسل" کے بارے میں اپنے تصور کو
بدل ڈالے۔ آج نسلی ملاحظات بے ردک ٹوک سیاست میں داخل
کئے جا رہے ہیں۔ انگریزی لفظ ریس (نسل) لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ اور
اس کا تصور پرانا اور عام ہے، لیکن نام بنا "نارڈک آریاؤں" کو نسل کا ایک
نیا سلک گھڑ دیا ہے جس کا انتہائی نقطہ، مشرق کا نظریہ ہے کہ کچھ نسلیں آقا
ہوتی ہیں۔ اور کچھ ان کی معنوب۔ جاپان نے بھی اس بارے میں اپنا الگ
انجمنہ نظریہ بنا لیا ہے۔ کسی نے کسی صورت میں نسل کا مسئلہ سب نسلوں کی
گردن پر سوار ہے۔ اس نے نازک صورت اس وقت اختیار کی جب مغربی
باسفندوں نے ملک گیر می اور آباد کاری شروع کی چند دنوں کی بات ہے کہ

ہر کچ کو بھی ایک کمیٹی پیفک کی نسلوں کے تعلقات کی کمیٹی کے نام سے بنائی
 پڑی تھی۔ جہاں کہیں سفید قوموں کے رنگین قوموں پر غلبے کا سوال رہا ہے
 وہاں اس نسلی مسئلہ کی بدولت مغلوب قوموں سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا
 ہے اور مغرب کی جنسیں بھرنے کے لئے مشرقی غلام پیدا کئے گئے ہیں لیکن جہاں
 کہیں یہ مسئلہ صرف سفید قوموں تک محدود رہا ہے۔ وہاں اس کی بدولت
 طرح طرح کی اور چھوٹی بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں۔ جب لڑائی ختم ہو جائے گی
 تب یہ محسوس ہوگا کہ برادری اور بھائی چارہ کے تصورات کو سفید رنگت والی
 کوٹھڑی میں بند کر کے رکھنا ان کے لئے غیر صحت بخش ہے اور ان میں انسانیت کی
 کھلی ہوئی سانس لینے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ ہوا تو اس جنگ کا مقصد پورا
 ہو جائے گا۔ اور وہ بے نتیجہ ثابت نہ ہوگی۔

سمندر پار کے ہندوستانیوں کا مسئلہ بھی اسی نسلی جھگڑے کی وجہ سے پیدا
 ہوا ہے لیکن یہ مسئلہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ دراصل سلطنت برطانیہ
 کا مسئلہ ہے۔ خارجی معاملات میں ہندوستان کو برطانیہ سے جو شکایتیں ہیں وہ
 زیادہ تر اس سلوک کی وجہ سے ہیں جو دولت مشترکہ کے ممالک اور سلطنت برطانیہ
 کی نوآبادیوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سلوک کی
 ذمہ داری برطانیہ عظمیٰ پر عاید نہیں ہوتی لیکن یہ واقعہ ہے کہ برطانیہ نے
 اس کی اصلاح میں اپنی پوری طاقت صرف نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
 نوآبادیوں اور دوسری نینوں کے باشندے اپنے دماغوں سے نسلی امتیازات

کو دور کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان اب تک اپنے غیر مالک میں بنے والے باشندوں کے حقوق کی حفاظت کا اطمینان بخش انتظام نہیں کر سکا ہے، اور برطانوی و دولت مشترکہ کے مختلف ملکوں میں ہندوستانیوں کو جو حیثیت دی جاتی ہے اسے دیکھتے ہوئے کوئی ہندوستانی دولت مشترکہ کے نصب العینوں کا پرجوش حامی نہیں بن سکتا۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر سیاسی زندگی میں سہولتیں، وطن گزینی، املاک، تجارت، تعلیم، سب باتوں کے متعلق پابندیاں لگا دی گئیں ہیں۔ سیلون میں انھیں سیلون والوں کے مساوی شہری حقوق حاصل نہیں ہیں۔ کیناڈا کے صوبہ برٹش کولمبیا میں ہندوستانی میونسپل صوبہ داری اور فیڈرل انتخابات میں حق رائے دہی سے محروم ہیں۔ برٹش کینیڈا، ٹری ٹی داد اور جمائی کایا میں ہندوستانیوں کو اپنے مردے جلانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ برٹش سنگھن بات ہے، اس لئے کہ اپنے مردوں کو جلانا ہندو کا مذہبی فریضہ ہے۔ کینیا، ٹانگانیا کا اور یوگنڈا میں ہندوستانیوں سے سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بارے میں ناروا امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ فی جی میں ہندوستانیوں کو زمین خریدنے کی اجازت نہیں ہے آسٹریلیا میں اگر کوئی ہندوستانی مستقل سکونت اختیار کرنا چاہے تو اس ملک میں داخلہ کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔

یہ تمام پابندیاں اور نسلی امتیازات نہ صرف ذلت آمیز اور غصہ دلانے والے ہیں بلکہ ان کو دیکھ کر یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر برطانوی دولت مشترکہ کا مقصد کیا ہے؟ ہندوستانیوں کو جو حیثیت دی جاتی ہے وہ اس بات کی کسوٹی ہے کہ دولت مشترکہ ایک حقیقت ہے یا صرف ایک غمن آئینہ

کلمہ اگر ہمارے ملک والوں کو وائی کاڈنٹ پیل کے ان الفاظ میں جو انھوں نے ۱۹۲۳ء کی امپریل کانفرنس میں کہے تھے "ڈومینیونوں کی غیر ملکی ہیئت سیاسیہ سمجھا جائے تو اب یہ غور کرنے کا وقت آگیا ہے کہ ہندوستان دولت مشترکہ کے الگ کیوں نہ ہو جائے میں اس اہم مسئلہ کو جذبات و تحت اثرات اور ساتھ ہی اصول کا مسئلہ قرار دیتا ہوں۔ اور یہ ہے بھی ایسا ہی کیونکہ ملک معظم کی چھ رعایا میں سے پانچ ہندوستانی ہیں۔ سیاسیات اور اقتصادیات کا سوال بعد میں آتا ہے۔ ہندوستان کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ اس کی رعایا پر وہ واجب پابندیاں بھی نہ عاید کی جائیں جو مختلف ڈومینیون اور نوآبادیاں اپنے طویل المدتی مفادات کی حفاظت کے لئے عاید کرتی ہیں، لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کی رعایا کے نقطہ نظر سے کو واضح طور پر سمجھ لیا جائے۔ ان ملکوں میں اپنے خاص نمائندے بھیج کر ہندوستان نے ظاہر کر دیا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کی وطن گردنی سے کچھ مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ انھیں پورے تعاون کے ساتھ حل کرنے کے لئے آمادہ ہے، لیکن ان باتوں میں ہندوستان کے ممبر کی بھی آخر ایک حد ہے۔ وہ دوسری طرف سے حسن سلوک کے اشارات کا انتظار کرتے کرتے اب تھک گیا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود کئی ایسی اہم اور ٹھوس باتیں ہیں جو ہندوستان کو دولت مشترکہ کے دائرہ کے اندر رہنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ دماغ اور کلچر (ثقافتی تعلقات) یہ اس سلسلہ کی مضبوط ترین کڑیاں ہیں۔ لیکن یہ سوچ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ ہندوستان کو دولت مشترکہ کے اندر اس

سے زیادہ اطمینان بخش دائرہ عمل دیا جائے جتنا کہ اسے اب حاصل ہے۔ مثلاً
 مشترکہ دفاعی اور خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ہندوستان کی آواز بھی سنی جائے
 جب تک یہ نہ ہو گا اسے دولت مشترکہ کے ساتھ وہ دل چسپی نہ ہو سکے گی جو
 اپنایت کے تصور سے ہوا کرتی ہے۔ برطانوی جنگی کامیابی میں ہندوستان
 کو مستقل نمائندگی ملنی چاہئے علی ہذا ڈومینین وزرائے اعظم کی کافرینس
 میں اس کی رائے کو دوسروں کے برابر وزن ملنا چاہئے۔ برطانیہ کی سفارتی
 قضا، نوآبادیاتی اور سول سروس میں ہندوستانیوں کا بھی تقرر کیا جائے
 سرکار ہند انڈین سول سروس میں انگریزوں کو رکھتی ہے، اسی طرح ملک معظم
 کی حکومت کو بھی چاہئے کہ اس کے زیر انصرام جو سروس ہیں ان میں
 ہندوستانیوں کو رکھے۔ اگر اس طرح کے انتظامی رشتے قائم ہوں گے تو ہندوستان
 سلطنت متحدہ اور بقید دولت مشترکہ کے مابین دو مستند تعلقات مضبوط
 رہیں گے ایہ آئندہ کا سوال ہے مگر فوری طور پر بھی ان تعلقات کو مضبوط بنانے
 کے لئے کچھل (ثقافتی) روابط قائم کئے جاسکتے ہیں۔

اگر برطانیہ کے ساتھ ہندوستان کا تعلق باقی رہتا ہے تو اس کے لئے گہرے
 کچھل تعلقات کا انتظام اربس ضروری ہے ہمارا یہ مقابلہ جو برطانیہ اور ہندوستان
 کے درمیان ایک محکمہ عہد نامے سے بحث کرتا ہے نامکمل رہ جائے گا اگر اس میں
 تعلقات کو بہتر بنانے کی کچھ تجویزیں نہ پیش کی جائیں جب تک دونوں ملکوں
 میں دل نہیں تب تک کوئی عہد نامہ پائدار نہیں ہو سکتا۔ جب ہندوستان
 کو ڈومینین کا درجہ یا آزادی مل جائے گی تو برطانیہ کے ساتھ اس کا رشتہ

ان چیزوں پر منحصر ہو گا۔

(الف) جذبہ اور آپس کا خیال اور لحاظ

(ب) دونوں طرف سے اس حقیقت کا اعتراف کہ ایک دوسرے

ربط مضبوط قائم رکھنے میں دونوں کی بھلائی ہے۔

ہندوستان میں اب ہر طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ طاقت ہندوستانوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دی جائے لیکن اس منتقلی کے طریقہ کے بارے میں اب تک کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ غیر مالک کی طرف سے جو تازہ ترین اعتراضات کئے جا رہے ہیں۔ ان کا ایک پہلو یہ ہے کہ برطانیہ نے ہندوستانی آبادی کی سماجی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے یا تو کچھ نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو برائے نام۔ ملک معظم کی حکومت کی پالیسی اب یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کی ہر طرح سے مدد کر کے اسے جلد سے جلد برطانوی دولت مشترکہ کی اقوام کا ایک مطلق اور خوش حال رکن بنا دیا جائے۔ اور یہ ایک ایسا مقصد ہے جس سے بلا امتیاز ذات یا عقائد کسی سمجھدار ہندوستانی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، بد قسمتی سے بحث اور مناظرہ کی گرامر می میں وہ باہمی اعتماد جو ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ کو ایک دوسرے پر ہے، نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے، اور برطانوی باشندوں کی خیر سگالی کا رخ اس ملک کے باشندوں کی طرف پھرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے بعد اپنے ملک کے ساتھ برطانوی رویہ کے بارے میں ہندوستانی بیظن ہوتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان میں خواندہ لوگوں کا فیصد می تناسب بلاشبہ بہت کم ہے لیکن دوسری طرف ریڈیو سننے والوں کی روز افزوں تعداد سے اس کی تلافی ہوتی جا رہی ہے۔ سینما بھی ملک پر اپنا تعلیمی اثر ڈال رہے ہیں۔ ہندوستانی

سپاہی تقریباً جنگ کے ہر منطقہ میں لڑتے رہے ہیں اور سمندر پار کی آزاد قوموں کے سپاہیوں کے دوش بدوش آزمائش اور فتح دونوں میں ان کے ساتھ رہے ہیں۔ اب ان میں بھی متحدہ اقوام کے دوسرے رفیقوں کی طرح یہ یقین پیدا ہو گیا ہے کہ جس مقصد کے لئے سب لکر لڑ رہے ہیں وہ حق اور انصاف پر مبنی ہے۔ ہر پڑے شہر میں سیاسی اقتصادی سماجی اور کچھ اور موضوعوں پر تقریریں کا رواج برہتا جا رہا ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہندوستان کی عامہ سے پہلے سے زیادہ باخبر ہوتی جا رہی ہے اور زندگی کی اعلیٰ تر نعمتوں کی خواہش روز بروز تیز ہو رہی ہے۔ مگر چونکہ اب ہندوستان اتر قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اور اگر برطانیہ کی طرف سے جسے وہ مغربی تہذیب اور کچھ کاسرچرٹ سمجھتے ہیں کوئی ہمدردانہ اور ہمت افزا لفظ اس کے کانوں میں پڑے تو وہ اسے ضرور شوق اور سمجھ داری کے ساتھ منیں گے۔

ہندوستان کے عوام بہت غریب ہیں، ان کا معیار زندگی بہت پست ہے۔ کافی خوراک نہ ملنے سے جو بڑے غناجے پیدا ہو سکتے ہیں وہ ان سب سے بچاؤ ہیں۔ ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں دولت کی تقسیم اتنی غیر مساوی ہو، پست اور بلند کا تفاوت آسانی سے جذبات کو برا ٹھیکہ کر دیتا ہے، اسی لئے اس صورت حالات کی اصلاح کی خواہش روز بروز زور پکڑ رہی ہے۔ چونکہ سرکار ہند عوام میں براہ راست پبلسٹی (اشاعت معلومات) بہت کم کرتی ہے اس لئے سیاسی پروپیگنڈا بازروں کے لئے میدان صاف ہو گیا ہے۔ پس یہ احساس کہ ہندوستان کی یہ ساری مصیبتیں بدلیسی حکومت کی لائی ہوئی ہیں روز بروز قومی ہوتا جا رہا ہے، اور ہندوستانی سیاست کاروں کا ایک طبقہ نیز ہندوستانی پریس کا ایک حصہ واقعات کو تلخ سے تلخ

العناظ میں اور بڑھا چڑھا کر بیان کر کے اس احساس کو اشتعل کر رہا ہے۔ موجودہ صورت حالات کی روک تھام نہ کرنا گو یا اپنے سر تباہی لانا ہے۔ ممکن ہے کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے لیکن ہندوستان جیسے بڑے ملک میں اس سے بھی ہماری مشکل آسان نہ ہوگی۔ لہذا یہ اندھن روی ہے کہ ہندوستان کی ہیودمی کے ضامن ہونے کی حیثیت سے برطانیہ عظمیٰ کے باشندے اس ملک کی عام ترقی میں حصہ لیں۔ جس طرح بھی ہو برطانیہ کی آواز کو ہندوستان تک پہنچانا ضروری ہے +

ان دوسرے فائدوں کے علاوہ جو ہندی برطانوی تعلقات کی وجہ سے برطانیہ کو حاصل ہوئے ہیں یہ ملک برطانیہ کی طرفداری میں دوزبردست لڑائیاں لڑ چکا ہے۔ یہ دونوں لڑائیاں صرف برطانیہ کی زندگی اور موت کا سوال ہی نہ تھیں بلکہ ان نصب العینوں کی بقا اور فنا بھی جن پر جدید تہذیب کا دار و مدار ہے ان پر منحصر تھی۔ اخلاقی پہلو جتنے اس جنگ میں نمایاں اور واضح ہیں، اتنے کبھی پہلے نہ تھے۔ پچھلی لڑائی کے بعد ہندوستان کو فتح کا پھل سیاسی اصلاحات کی صورت میں ملا اور ان ہی کی وجہ سے وہ اپنی اقتصادی اور سماجی حالت کو سدھار سکا۔ ^{۱۸۵۷ء} ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں ہندوستان فوجیں جرمن فوجوں اور لندن کے درمیان سینہ سپر ہو گئی تھیں۔ اور جرمنی اور ترکی کی مشترکہ چڑھائی کا مقابلہ کر کے مشرق وسطیٰ کو بچا لیا تھا۔ موجودہ لڑائی میں اس وقت جب کہ برطانیہ اکیلا میدان

میں کھڑا تھا ہندوستان کی فوجیں ڈنکرک سے لیکر ہانگ کانگ تک جہاں کہیں بھی سلطنت کے مقامات میں کھانچے نظر آتے تھے اُن میں بھر رہی تھیں۔

ہندوستان میں بھرتی کا سب سے زیادہ زور اگست ۱۹۴۷ء میں یعنی اس زمانہ میں ہوا جبکہ کانگریس نے اپنی سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ آج آپ کو ہندوستان کے دور دراز دیہاتوں میں میدان جنگ سے ہندوستانیوں کی لائی ہوئی دل ہلادینے والی سوخائیں ہاتھ پاؤں سے معذور سپاہیوں کی صورت میں ملتی ہیں ہندوستان کی بیواؤں اور ماؤں کے لیے جن کے شوہر اور بیٹے لڑائی میں کام آئے ہیں اپنی انگلستان کی اُن بہنوں کی طرف سے جنہوں نے اس مقصد کے لئے قربانیاں دی ہیں شکریہ اور قدردانی کا ایک ایک لفظ خوشی کا موجب ہوگا ہندوستانی سیاست کار برطانیہ کی مخالفت میں جو دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں ان کی وجہ سے اکثر اوقات ہندوستان کا یہ تعاونی اور دوستانہ پہلو نظروں سے اچھل ہو جاتا ہے۔ ہمارے سیاست کار بھی تو آخر برطانوی حکومت ہی کی پیداوار ہیں۔ برطانیہ نے ہندوستانی باشندوں میں یہ یقین اور اعتماد پیدا کر دیا ہے کہ اس مرتبہ ہندوستان کی خود اختیاری صلح کا ایک قدرتی حصہ ہوگی بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی سپاہی کرایہ کا ٹوٹے اور کچھ برطانوی اشخاص بھی اسے سچ سمجھنے لگے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد زراعت پیشہ ہے اور کسی صنعتی کارخانے یا شہر میں کام کرنے والے ایک اوسط مزدور کے برخلاف ان کا وجود اس ملک کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے جنگ میں ہندوستان نے جو کچھ مدد دی ہے اس کا اندازہ صرف اس کی فوج بیڑے اور ہوائی فوج کے کارناموں ہی سے نہیں ہوتا ہے بلکہ کاحانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد، دانشورائے فن و ادب میں رضا کارانہ طور پر دیئے گئے

چندوں، والیان ریاست اور ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں کے کارناموں اور ہندوستانی صنعت کاروں کے اس پروجیکشن تعاون سے بھی ہوتا ہے جس کی بدولت زمانہ جنگ میں کارخانے پورے زور کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ ہندوستانی آبادی کی غالب تعداد کی کہانی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان کا سبب جوگ تقدیر ہو چکا ہے۔ یہ کہانی ایسی ہے جسے برطانیہ غلطی کے باشندوں کی پہچانا چاہیے۔ اس کی قدر و قیمت اس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ ہندوستان کی یہ ساری جنگی مساعی رضا کارانہ اصولوں پر ہوئی ہیں۔

دوسری طرف ہر شخص جانتا ہے کہ برطانیہ میں ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ ہمدردی اور خیرگمانی کے جذبات عام ہیں برطانیہ کے ساتھ شراکت سے ہندوستان کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ہندو کی زبردست طاقت کے مقابلہ میں برطانیہ جس طرح سینہ سپر ہوا اور اس کے باشندوں نے جس طرح اپنے آپ کو منظم کر کے آزادی کی خاطر کام شروع کیا۔ اسے ہندوستان میں ہر شخص نے تفریق کی نظر سے دیکھا ہے۔ ہندوستانیوں کو بڑی خوشی ہوگی اگر حب وطن اور اتحاد کی یہی روح ان کے دس کی طرف منتقل کر دی جائے اس کے علاوہ برطانیہ غلطی کی ایک کھل کرل (ثقافتی) حیثیت بھی ہے اور اس کا ہندوستان کے اپنے تہذیبی ورثہ میں سمو یا جانا اور زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جو ذہنی رشتے ہیں ان میں مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ اور بنانا چاہیے۔ افسوس کی بات ہے کہ وزارت اطلاعات نے ان تصویروں کو ہندوستان کے سامنے پیش کرنے کے بارے میں انک کچھ کام نہیں کیا ہے۔

ن
مادی حیثیتوں سے اشتراک مقاصد اور مفاد کے علاوہ برطانیہ اور ہندوستان میں روحانی اور انسانی اعتبار سے کچھ قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ جسے اگر

وضاحت کیساتھ بیان کیا جائے تو ہندوستان کے برطانوی دولت مشترکہ کے دائرہ کے اندر رہنے کی مزید تائید ہوتی ہے۔ ہندوستان میں سیاسی پہچان کا جو طویل دور گزرا اور ملک کے اندر مختلف گروہوں کے درمیان جو آؤنرش ہوئی اس نے یہاں کے باشندوں کو اپنی حالت پر غور و تأمل کا عادی بنا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کا بڑا اشتراکت دار یعنی برطانیہ اسے یہ بتائے کہ ایشیائی امن و امان اور ایشیاء کی ترقی کے محور کی حیثیت سے ہندوستان کا برطانوی دولت مشترکہ کے جھرمٹ میں رہنا کتنا اہم ہے۔

برطانیہ کے حریت پسندانہ خیالات تک صرف انھنی ڈوی نینوں کو فائدہ پہنچا ہے جہاں یورپی نسلیں آباد ہیں۔ بڑی بات ہوگی اگر ہندوستان کی طرح ایک دوسری نسل کے باشندوں کو بھی برطانیہ کے جمہوری ورثہ میں سے کچھ حصہ ملے اور برطانوی دولت مشترکہ اقوام کے مشترک نصب العینوں میں وہ بھی شریک ہو جائے۔ مذکورہ بالا ملاحظات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسبِ قیل باتوں کی کتنی زیادہ ضرورت ہے

(الف) اہل برطانیہ کو یہ بتانا کہ ہندوستانیوں نے اس جنگ میں کیا حصہ لیا ہے۔ لڑائی کے اثرات ان کے گھروں، ان کی معیشت اور زندگی کے بارے میں ان کے عام نقطہ نظر پر کیا پڑے ہیں، اگر ہندوستان اپنے کومیون دولت اور سامان کو لڑائی کے لئے وقف نہ کر دیتا تو وہ ان خود اپنی ترقی کے بارے میں کتنا اہم کام لے سکتا تھا۔

(ب) اہل ہندوستان کو یہ بتانا کہ برطانیہ کے باشندوں میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی اور خیرگالی کے جذبات موجود ہیں۔ اس ہمدردی کو عملی جامہ پہنا کر برطانیہ کے باشندے ہندوستان کو اسکی چند اہم ترین شکلات حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں مثلاً جہالت اور افلاس کا خاتمہ، حفظانِ صحت و صفائی کے انتظامات رہنے کیلئے بہتر مکانات، زیادہ

خواب اور کپڑا، اور زیادہ روزگار۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ برطانوی کے بعد برطانویہ کے باشندے اپنے قابل مردوں اور عورتوں کو ہندوستان بھیجیں تاکہ وہ خدمت اور باہمی امداد کے جذبہ کے تحت ہندوستانیوں کو ان مسائل کے حل کرنے میں مدد دیں ؟

یہ ہیں وہ حقائق جو آج ہندوستان کے بین الاقوامی ماحول میں پائے جاتے ہیں وہ خطرات جو آج اسے درپیش ہیں اور وہ مفادات جن کی حفاظت کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ہم نے ایک مشاہدہ کی طرح ان سب باتوں کو حتی الامکان واقعاتی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔ ہندوستان کا دستور اور سلطنت متحدہ کے ساتھ اس کے آئندہ انتظامات ایسے ہونے چاہئیں کہ خطرات پر قابو پایا جائے اور مفادات کی حفاظت ہو جائے۔ ان دونوں باتوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اندرونی اور خارجہ مسائل کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان کے خارجہ مسائل کے بارے میں اتفاق رائے تو بہت کچھ ہے لیکن بد قسمتی سے ان میں بہت کم دل چسپی لی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اندرونی مسائل میں دل چسپی حد سے زیادہ ہے اور اتفاق رائے بہت کم۔ یہ دونوں مسائل صرف اس صورت اطمینان بخش طریقہ پر حل ہو سکتے ہیں کہ خارجی اور داخلی دونوں مسائل پر برابر کی توجہ دی جائے۔

ہندوستان کے خارجی تعلقات کے مطالعہ سے ہمیں اس کے گھر پر معلق کی ترتیب اور سلطنت متحدہ کے ساتھ اس کے عہد نامہ کے بارے میں کیا قطعی

ہدایت مل سکتی ہے ؟ اس سوال کا جواب یقیناً متنازعہ فیہ ہوگا ، اس لئے کہ خارجی حالات کے جائزے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ تو اپنی جگہ واضح ہے۔ لیکن جو لوگ صرف اندرونی صورت حالات سے بحث کرتے ہیں ان کی رایوں کی شدت اور انتہا پسندی یا تو حقیقت پر پردہ ڈال دیتی ہے یا اسے توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہے۔ بہر حال اس مقالہ کا مقصد یہی ہے کہ جو نتیجہ بھی نکلتا ہو اسے بے کم و کاست اور گھریلو معاملات سے جھجکے بغیر پیش کر دیا جائے۔ سب سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی وضع قائم رکھنا از بس ضروری ہے۔ حفاظتی اور فوجی اعتبارات سے یہ بات ناگزیر ہے۔ عالمی مفاد کا تقاضا ہے کہ ہندوستان ایک بڑی طاقت بن جائے۔ دوسرا بلقان رقبے۔

ہندوستان کی وحدت کے راستہ میں کیا چیز مائل ہے ؟ اگرچہ یہ مقالہ گھریلو معاملات پر نہیں ہے لیکن چونکہ خارجی مسئلہ کو داخلی مسئلہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا ، اس لئے ہمیں آخر الذکر پر بھی ایک مختصر تبصرہ کرنا ضروری ہے۔

آٹھواں باب

بنیادی اندرونی مسئلہ - ہندو مسلم تعلقات

(الف) گزے ہوئے خوش گوار زمانہ کی یاد

ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اختلافات آج پیدا ہو گئے ہیں، اُس پر ہے کہ کہیں ان دونوں قوموں کے اس تاریخی بھائی چارہ کو خاک میں نہ ملا دیں جو مسئلوں کے زمانہ سے شروع ہوا اور صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ یہ بات اکثر بھلا دی جاتی ہے کہ ہندوستان میں تفرقہ اندازی تاریخی سلطنت معنویہ کے واحد تعمیر می عنصر کی مخالفت کرنے کے مرادف ہے۔ بے شک آج کے ہندوستانیوں کی معلومات اپنے پرکھوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ لیکن جب ان کے خیالات کو آریائی - سے راسی کی تصور انتخاب کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو وہ ہیچ و پوچ معلوم ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے کے ہندوستانی لیڈروں اور مفکرین نے ان دو مذاہب

میں یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہمارا شکوہ نے انھیں مجمع البحرین (دو ساکروں کا سنگم) کہا ہے۔ کبیر اور نانک نے بھی انھیں آپس میں سمونے کی کوشش کی اور اپنی عبادتوں میں ”اللہ جیم اور رام“ دونوں کے نام حاصل کئے۔ ہندو اور مسلمان استادان فن نے بھی جذبہ ہم آہنگی سے متاثر ہو کر ایسے مشترکہ صنائع اور حرفے اختراع کئے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے دل کو لگتے تھے اور دونوں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ مسرت اور حسن کاری کے مشترکہ تصورات وجود میں لائے گئے۔ افسوس ہے کہ آج ہندوستانی اس تعمیر کی خرابی کے پیچھے ہے جو تاریخ نے اپنے ہاتھوں اس کے لئے بنائی تھی وہ اس تاریخ کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کے اہل نہیں رہے اس لئے اب وہ اسے بدنام کرتے پھرتے ہیں +

مقام تعجب ہے کہ اتنی مشترکہ باتوں کے باوجود آج ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ بکھرتا جاتا ہے۔ ہمارا فرض تو یہ تھا کہ ان باتوں سے کام لے کر اتحاد کی اس بنیاد کو اور وسیع کریں۔ ہم نے اپنے اسلاف سے صرف موسیقی اور ادبیات مصوری اور فن تعمیر ہی کا مشترکہ تہذیبی ورثہ نہیں پایا ہے، بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے کئی جنگوں میں شائد بشتانہ لڑ کر ہمارے لئے ایک مشترکہ سیاسی مقدمہ بھی بنا دیا تھا۔ علیٰ ہذا معاشرتی معاملات میں بھی ان دونوں سنتوں کے روایات اور رواج آپس میں رچے بچے تھے۔ شہنشاہِ بابر کے زمانہ میں بھی زندگی کے مشترکہ طریقے وجود میں آچکے تھے چنانچہ بابر نے انھیں ”ہندوستانی طریقوں“ کے نام سے یاد کیا ہے، اور ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ملی جلی خصوصیات نظر آتی تھیں۔ پھر لشکر کی بولی کے اندر سے اردو

زمانہ نے جنم لیا۔ خود مذہب کے بارے میں جو اس زمانہ میں عزیز ترین چیز سمجھا جاتا تھا، ایک کا اثر دوسرے پر پڑا۔ ہندو عوام کے مذہب میں مسلمانوں کے اثر سے ایک نیا رخ اور ایک نیا رنگ پیدا ہوا اور خود اسلام پر بھی ہندوستانی رنگ چڑھ گیا۔

ہندوستان مسلمانوں کا بھی جنم بھوم مسترار پایا۔ اس کی داغ بیل تو اسی وقت پر پڑ چکی تھی جب قطب الدین نے دہلی کی سلطانی کو سلطنت غزنویہ سے الگ کر لیا تھا۔ اس بات کی صاف اور تاکید ہدایت کی گئی تھی کہ مسلمان بادشاہ اپنی رعایا کے مختلف طبقوں میں کسی قسم کا امتیاز روانہ نہ رکھیں۔ ان پر یہ واجب قرار دیا گیا تھا کہ وہ ”ہر طریقہ کو یکساں چشم کرم سے دیکھیں اور ایک کے ساتھ سگی ماں کا اور دوسرے کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک نہ کریں“ بابر کی توڑک کا ابو الفضل کی آئین اکبری سے مقابلہ کیا جائے تو ماتر بھومی کی حیثیت ہندوستان کے ساتھ محبت کے دل چسپ مدارج نظر آتے ہیں۔ بانی سلطنت مغلیہ (بابر) نے شکایت کی تھی کہ ”ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں بہت کم راجتیں میسر ہیں“ لیکن اکبر کے تخت پر بیٹھے تک نو وار دوں کا یہ نقطہ نظر بدل چکا تھا۔ اس کا مورخ (ابو الفضل) ”ہندوستان کے حسن“ کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور اپنے موضوع سے گریز کی مغفرت ان الفاظ میں کرتا ہے :-

”اُس کی وجہ وہ محبت ہے جو مجھے اپنے وطن کے ساتھ ہے۔“

دب، ہماری موجودہ یاس انگیز حالت !

ابوالفضل کے زمانہ کی طرح اب بھی مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنا اور اس کے تصور سے فیضان حاصل کرنا نہیں چھوڑا ہے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۴۷ء ہی کی بات ہے، کہ مسٹر جناح نے یہ الفاظ لکھے تھے :-

”مختصر یہ کہ ایک ایسا دستور بنایا جائے جو یہ تسلیم کرے کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں، اور انہیں اپنے مشترکہ ماتر بھومی (وطن مادری) کی حکومت میں حصہ ملنا چاہئے۔“

بے شک مسٹر جناح کا دو قوموں کا نظریہ وجود میں آچکا ہے، لیکن مشترکہ وطن مادری کا تصور ابھی تک نہیں مٹا ہے اور مشترکہ حکومت میں حصہ اب تک جتنا جاگتا عقیدہ بنا ہوا ہے۔ اس کے دو مہینہ بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں پاکستان بنانے کا تصفیہ کیا۔ یہ خیال کہ ہندوستان مسلمانوں کا وطن مادری ہے اب بھی قائم ہے اس لئے کہ پاکستان کا تصور اسی پر مبنی ہے لیکن مشترکہ وطن مادری کا تصور اب باقی نہیں رہا ہے۔ پاکستان نے مسلمانوں کے وطن مادری کو مقامی بنا کر اسے صرف ہندوستان کے ان حصوں تک محدود کر دیا ہے جہاں آج انہیں اکثریت حاصل ہے، اور اس طرح مقامی بنا دینے کے بعد اب وہ دعوے کرتے ہیں کہ اسے بقیہ ہندوستان سے جس کے گیت اقبالؒ نے ہندوستان ہمارا کے عنوان سے گائے ہیں، الگ کر دیا جائے۔ پاکی کی صفت کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

اگر ایک طرف ام گڑھ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس کی صدارت

کہتے ہوئے ”ایک متحدہ اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم“ کا ذکر کیا تو دوسری طرف لاہور میں لیگ کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں یہ کہا گیا۔

”یہ خیال کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قومیت بنا سکیں گے محض ایک خواب ہے“ ایک مشترکہ حکومت میں حصہ لینے کے خیال کو چھوڑ کر اس کی جگہ مسلمانوں کے لئے ایک مجددِ اگائے قومی حیثیت کا مطالبہ کیا گیا اور اب ڈ ایک با اقتدار ریاست چاہتے ہیں ان کی رائے میں وفاق اب کسی کام نہیں رہا ہے۔ لیگ کی قرارداد میں جس کی تحریک فضل الحق صاحب نے کی تھی یہ مطالبہ کیا گیا۔

”ان علاقوں کو جہاں تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقے، آپس میں ملا کر ایسی خود مختار ریاستیں بنائی جائیں جن کے ترکیبی اجزاء خود مختار اور با اقتدار ہوں۔ لیکن نہر دپورٹ پر ایک نظر باز گشت ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تصفیوں کی مخالفت کرتے ہوئے خود مسلم لیگ نے وفاق (فیڈریشن) پر اتفاق کیا تھا۔ نہر دیکٹی نے بہ طلبہ آراء اپنا نصب العین خود مختار قومی بینوں کے دستور کو قرار دیا تھا اور ڈوی مین درجہ کے حصول کو دو دوسرا فوری قدم“ بتایا تھا کیٹی میں یہ خواہش غالب تھی کہ ایک مضبوط مرکز (سنٹر) وجود میں لایا جائے جو ہندوستان کی وحدت کو موثر طریقہ پر قائم رکھ سکے، اور جو دستور خود نے تجویز کیا تھا وہ بھی وحدانی قسم کا تھا۔ وفاق پر کیٹی نے بخیدگی سے غور نہیں کیا تھا سائنس رپورٹ چ حکومت ہند کے مراسلہ (مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۳ء) میں بھی کل ہند وفاق کو ایک بعید نصب العین قرار دیا گیا تھا۔ حکومت ہند کی رائے یہ تھی کہ۔

”اس قومی وحدت کے جذبہ کو جو مرکزی برطانوی نظم و نسق کے اثر سے

بتدریج پیدا ہو گیا ہے قربان کر دینا درست نہیں ہے۔“

ہنرورپورٹ کے مصنفین جداگانہ انتخابی حلقوں کے ساتھ اس رائے کو مطابق نہ کر سکے اور انھوں نے یہ سفارش کی کہ دس سال بعد اس کی احبہ اگانہ انتخابات (نظر ثانی کی جائے۔ غالباً ان کے ذہنوں میں وہ نظریہ تھا جو سر آسٹن چیمبرلین نے انجمن اقوام کی طرف سے پیش کیا تھا۔

جن لوگوں نے اقلیتوں کی حفاظت کا نظام بنانے کا تصفیہ کیا ہے ان کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ کسی قوم کے اندر ایسا فرقہ قائم کر دیا جائے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قومی زندگی سے الگ تھلگ رہے۔“

اس نظریہ پر عمل کرنے میں کمیٹی نے حد سے زیادہ منطقی پرستی کا ثبوت دیا سیاسی سمجھوتے کے لئے فوری ماحول کا لحاظ کرنا اور خود کو زمانہ کی ذہنی آب و ہوا سے مطابق کرنا ضروری ہوتا ہے۔

سیاسیات میں عملی حل کے بارے میں جو جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں وہ مشکل سے سلجھتے ہیں اس لیے کہ وہاں سوال کسی منصفانہ حل کو قبول کرنا یا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اس انصاف کا درجہ کیا ہے۔“

ہنرورپورٹ کے خلاف جو رد عمل ہوا اس نے مسلم سیاسیات کے دو حصوں کو جن میں سے ایک (مسلم کانفرنس) سر محمد شفیع کی قیادت میں تھا اور دوسرا (مسلم لیگ) مسٹر ایم اے، جناح کی زیر صدارت آپس میں متفق کر دیا اور یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو ہنر ہائس آف آغا خان کی زیر صدارت یہ قرار پایا کہ صرف فاتی نظام ہی ہندوستانی حالات کو دیکھتے ہوئے سب سے موثر ترین طرز حکومت ہے۔“

یہ یاد رکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس وفاقی اسکیم کا تصور قانون اصلاحات ۱۹۳۵ء میں کیا گیا تھا اسے آگے چل کر خود مسلم لیگ نے مسترد کر دیا۔

EDWARD BENES: DEMOCRACY TODAY AND

TOMORROW P. 22

مذکورہ بالا قرارداد کی توثیق دوسرے سال یعنی ۱۸۵۷ء میں الہ آباد والے لیگ کے اجلاس میں کی گئی۔ مشہور شاعر سر محمد اقبال اس کے صدر تھے اور انہوں نے ”شمالی مغربی ہندوستانی مسلم ریاست“ کی تجویز پیش کی ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ صوبوں میں آبادی کی موجودہ تقسیم مسلمانوں کے حق میں مضر تھی اس لئے جداگانہ انتخابی حلقوں کا طریقہ لگایا تاکہ نمائندگی کا توازن مسلمانوں کے حق میں ہو جائے۔ اس مشکل کو نمائندگی کے اصول میں خلل ندری کیے بغیر یوں بھی حل کیا جاسکتا ہے کہ صوبوں کی ترکیب نئے سرے سے کی جائے۔ ان کی مجوزہ مسلم ریاست صرف ایک نئے صوبہ کا قیام تھا جو پہلے کی طرح ہندوستان ہی کا جزو رہتا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بتادینا چاہیے کہ ہنر و کمٹی نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلم اکثریتوں کا ہندو اکثریتوں کے ساتھ توازن قائم رکھنے کیلئے صوبوں کی سرحدیں نئے سرے سے مقرر کی جائیں۔ صوبوں کی نئی ترتیب کی اس سوچ پر زیادہ جامع اسکیم ڈچ سر سکندر جیات خاں نے ۱۹۰۹ء میں اپنی کتاب *Outline of a scheme of Federalism in India* (دفاق ہندوستان کی اسکیم کا خاکہ) میں بیان کی تھی اور جس پر انہوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۱۱ء کو پنجاب اسمبلی میں اپنی ایک تقریر میں بحث کی تھی ان کا تصور یہ تھا کہ پورے ہندوستان کی نئے سرے سے علاقہ داری تقسیم کی جائے۔ تقریباً مساوی رقبہ رکھنے والے سات علاقے (REGIONS) ہوں جن کی آبادیاں متوازن ہوں جس سے ہر فرقہ کو منصفانہ نمائندگی مل سکے۔ ہر علاقہ کی اپنی اسمبلی ہو اور سب دفاقی اسمبلی کے ساتھ مربوط کر دیئے جائیں۔ پروفیسر کوپلینڈ نے علاقوں کی تعداد بجائے سات کے چار کر دی ہے، لیکن ان دونوں اسکیموں میں ایک مرکز کا تصور موجود ہے۔

آج ہم قسمت کے ایک عجیب چکر میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ذہن میں یہ تکلیف دہ شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ کیا ہم میں اتفاق و اتحاد کی صلاحیت کی عدم موجودگی اس وجہ سے ہے کہ ہم میں روشن خیالی نہیں ہے؟ یا اس کی وجہ وہ حالات ہیں جن کے ماتحت ہم سے سمجھوتہ کرنے کو کہا جاتا ہے؟ یا ہمارے خود غرضی کو اس میں دخل ہے؟ بعض لوگ ”ہندوستان چھوڑ دو“ کے مطالبہ کو ہمارے ہر مرض کا علاج سمجھتے ہیں۔ بہت سے اسے ایک انتہائی قسم کا علاج سمجھتے ہیں جو مرلین کو لب گورہو پونچا دے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”خدا یا زراچ“ ہماری حفاظت کرے گا۔ تعجب ہوتا ہے کہ کیا واقعی حالات اتنے بگڑ چکے ہیں؟ کیا اس قسم کی مایوسی سے کسی سمجھوتے کی اُمید ہو سکتی ہے؟ مایوخی تو یہی بتاتی ہے کہ بعض اوقات کسی صورت حالات کی انتہائی مایوسی اور شدید مشکلات ہی کے اندر سے نجات کی راہیں نکل آتی ہیں۔ ۱۶۸۹ء کے انگریزی سمجھوتے کے بعد انڈیا میں انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کا اتحاد اور ۱۸۸۷ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا وجود میں آنا، یہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔

اس امر پر تو سب متفق ہیں کہ طاقت انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوستان میں منتقل ہونی چاہیے۔ لیکن اب تک اس بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکا ہے کہ طاقت کی یہ منتقلی کیونکر اور کس کی طرف ہو۔ اگر ایک مرتبہ اس ”کیونکر“ کے بارے میں سمجھوتا ہو گیا تو برطانیہ کی طرف سے جو بے قیامادی ہندوستان میں ہے وہ ایسے غائب ہو جائے گی جیسے سورج نکلنے ہی کبھی ٹھٹھاتی ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ ہمیں اپنا دستور مرتب کرنے اور

اپنی تاریخ خود تفسیر کرنے کی آزادی میاے۔ یہ آزادی کرپس کی تجاویز میں موجود ہے بشرطے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں۔ ہم ہی آئندہ نسلوں کی بے زبان توقعات کے امین ہیں۔ بعد جنگ کی عالمی برادری کی آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ کیا یہ کام ہندوستان کے بڑے بڑے فرقوں اور برطانیہ عظمیٰ کی قوت سے باہر ہے؟

ج) حکومت خود اختیاری کی جدوجہد میں ”خود“ کا مرتبہ

یہ واقعہ ہے کہ قوت اور اختیار کا جو پہلا ریزہ انگریزوں نے ہندوستان کو دیا، اسے دیکھتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ سوال یہ تھا کہ حکومت خود اختیار کی صورت میں خود کا اشارہ کس کی طرف اور کس حد تک تھا؟ غرض کہ فرقہ وارانہ منافشات اصل میں دستور میں اصلاحات ہی صمیمہ تھے۔ آئیے ان کی تاریخ پر غور کریں اور دیکھیں ایک کو دوسرے کے ساتھ کیا نسبت رہی ہے؟

۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ میں ایک ایسے مستقبل کا تصور باندھا گیا تھا جب کہ ہندوستان نامندہ حکومت کے قابل بن جائے گا۔ لیکن اُس وقت سوائے اس کے بعض اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہندوستانیوں کے لئے کھول دیئے جائیں اور کچھ ہندوستانیوں کو ملا۔ غور کے بعد ۱۸۵۸ء کے قانون کی رو سے ہندوستان کی حکومت ایک تجارتی کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اس کے تھوڑے عرصے کے بعد ۱۸۶۱ء کے قانون کی رو سے خواہ چھوٹے پیمانہ ہی پر بھی لیکن دستور ہند میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ حکومت ہند میں ہندوستانیوں کو بھی شریک

کیا جائے۔ ۱۸۵۰ء میں وائسرائے وقت لارڈ ڈفرن کی سرپرستی اور نیک
 متناؤں کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ اس کے پہلے اجلاس
 میں ہندوستان کی آبادی میں قومی ہمت کے مظاہرہ بڑی فصیح و بلیغ
 تقریریں ہوئیں۔ ۱۸۹۲ء کے کونسل ایجٹ کی روسے، اگرچہ برائے نام سہی
 پھر بھی کونسل کی رکنیت میں اضافہ اور اس کے مباحث کے اختیارات میں
 توسیع کی گئی۔ تقسیم بنگال کے بعد سے حکومت اور کانگریس کی راہیں الگ
 الگ ہو گئیں، خود کانگریس میں بھی "سورت کے منافقہ" (THE SURAT SPLIT)
 کی وجہ سے پھوٹ پڑ گئی اور انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کی ٹکڑیاں الگ
 الگ ہو گئیں۔

قانون ۱۹۰۹ء جس کی روسے، منٹو۔ مارلے اصلاحات نافذ ہوئے۔ ہندوستان
 کی دستوری تاریخ میں ایک نئے اور نازک دور کا نقطہ آغاز ہے جداگانہ انتخابی
 حلقوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ نمائندگی کا جو طریقہ اس قانون سے نافذ ہوا وہ
 جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھا۔ مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے
 وقت لارڈ منٹو سے ملا۔ وفد نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی تاریخی اہمیت اور
 سلطنت برطانیہ کی جو خدمات انھوں نے کی ہیں ان کی بنا پر مسلمانوں کو ان
 کے تناسب سے زیادہ نمائندگی ملنی چاہیے۔ اس حد تک تو یہ مطالبہ معقول اور
 منصفانہ تھا، لیکن جداگانہ نمائندگی کے طریقے نے دونوں فرقوں کے درمیان
 روزانہ عداوتیں پیدا کی کایج بودیا اور اب یہ عداوتیں اس حد تک بڑھ گئی
 ہے کہ یہ طریقہ بھی ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ ایک ایسا صحیح اور منصفانہ مقصد
 جس طرح غلط طریقے اختیار کرنے کی وجہ سے برباد ہوا ہے اس کی مثال شاید
 ہی تاریخ میں ملتی ہو۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جب ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے جانے کے چرچ ہو رہے تھے، ہندوستانی لیڈروں نے اپنے گھر کی حالت درست کرنے کی سچے دل سے کوشش کی۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت کرتے ہوئے مسطورج نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے:-

”مغربی تعلیم کے اثر سے نئے ہندوستان میں تیزی سے خیالات، مقصد اور نقطہ نظر کی وحدت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔“

اسی زمانہ میں لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس بھی ہوا تھا، اور کانگریس اور لیگ کے درمیان وہ مشہور معاہدہ ہوا جس کو اب ”معاہدہ لکھنؤ“ (Lucknow Pact) کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے حالات میں ”جداگانہ انتخابی حلقوں کو ختم کر دینا تو ممکن نہ تھا، لیکن پھر بھی دونوں سر تقویٰ اعلیٰ درجہ کی سوچ بوجھ اور باہمی رواداری کے جذبہ کافیت دیا۔ کانگریس نے بھی حسب موقع فرص شناسی سے کام لے کر مسلمانوں کو نسبتاً بڑھ چڑھ کر مراعات دیں۔ مارلے۔ منٹو اسکیم کی رو سے مسلمانوں کی نمائندگی بنگال میں ۱۰ فیصدی اور پنجاب میں ۲۵ فیصدی رکھی گئی تھی لکھنؤ معاہدہ میں یہ تناسب بڑھا کر بنگال میں ۴۰ فیصدی اور پنجاب میں ۵۰ فیصدی کر دیا گیا۔ اپنی اقلیت والے صوبوں میں بھی مسلمان اسی طرح فائدے میں رہے مثلاً یو۔ پی میں جہاں ان کی آبادی ۴۱ فیصدی ہے انھیں ۳۰ فیصدی نمائندگی دینا منظور کیا گیا۔ مرکز میں ایوان کی منتخب شدہ نشستوں میں سے ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کو دیئے جانے کا فیصلہ ہوا، اور کانگریس کے دستور میں یہ شرط لکھ دی گئی کہ کوئی مسودہ قانون جس سے کوئی فرقہ متاثر ہوتا ہو اس وقت تک زیر غور نہ آئے گا جب تک کہ متعلقہ فرقہ کے پچھ منتخب شدہ اراکین اس پر رضامند نہ ہوں۔

اصلاحات ۱۹۱۹ء کے مصنفین نے لکھنؤ کے سمجھوتے کو قومی احساس کی روزافز قوت کی شہادت قرار دیا اور اسے خوش آمدید کہا۔ اور اگرچہ انھوں نے ”جاگنا انتخابی حلقوں“ کی برقراری کو برا بتایا۔ لیکن مفادات کی یہ تفسیری قانون اصلاحات میں قائم رکھی اگرچہ اس کی دفعات لکھنؤ معاہدہ کی شرائط سے مختلف تھیں۔

اس درمیان میں کانگریس پر انقلابی نقطہ نظر غالب آگیا اور رولٹ ایکٹ (ROWLATT ACT) سے اسے اور شرمیلی۔ مسٹر گاندھی نے کانگریس کی لیڈر سی اپنے ہاتھ میں لے لی اور عدم تعاون کی پالیسی شروع ہو گئی۔ تھوڑے عرصے کے لیے مسند خلافت کے سلسلہ میں مشترکہ عدم تعاون کی صورت میں ہندو مسلم اتفاق رونما ہوا۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کو توڑ ڈالا تو یہ اتفاق بھی بے نتیجہ ثابت ہوا اور اب شدید فرقہ وارانہ فسادات کی گرم بازاری ہوئی۔ جب کبھی عدم تعاون کی تحریک شروع ہوتی، ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات بھی پیدا ہو جاتے۔ ۲۹ اگست ۱۹۲۰ء کو ہندوستانی مجلس مقننہ سے خطاب کرتے ہوئے لارڈ ارون (IRWIN) نے اتفاق اور اتحاد کی اپیل کی۔

کانگریسیوں کے ایک گروہ نے ”سوراج پارٹی“ بنالی تھی جو مجلس مقننہ کے اندر ان کے توسط سے دستور ہند پر کامیابی کے ساتھ حملے کرتی رہتی تھی یہی لڑائی بنگال کی مقننہ میں مسٹری۔ آر۔ داس بڑی دھوم دھام سے لڑ رہے تھے۔ جب نومبر ۱۹۲۰ء میں لارڈ برکن ہیڈ (BIRKIN HEAD) نے سامن کیشن مقرر کیا تو اس کا اعلان کرتے ہوئے لارڈ ارون نے کہا ”حال میں قانون کے قبل از وقت نفاذ کے بارے میں بہت خاصا زور ڈالا گیا ہے“

اس عرصہ میں کچھ تو اس چیلنج کے جواب میں جو لارڈ برکن سپیڈ سے

ہندوستانی تعمیر می سیاسیات کے مفکرین کو دیا تھا، اور کچھ ملک کو اصلاحات کی آنے والی قسط کے واسطے تیار کرنے کے لئے قوم پرست انیشیٹس، لیڈروں سے ہندوستان کے لئے ایک دستور کا مسودہ بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اور ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی اس کام کے لئے بنا دی گئی ان لوگوں نے ہندوستان کو ڈومی نین درجہ دیئے جانے کی تائید میں مسودہ تیار کیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تقریر کرتے ہوئے لارڈ اردن نے حکومت برطانیہ کے ایماء سے یہ اعلان کیا کہ ڈومی نین درجہ مائونٹ فورڈ اصلاحات میں مضمر ہے۔ وائسرائے کا یہ اعلان اس وجہ سے اور بھی ضروری تھا کہ ڈومی نین درجہ کے بارے میں سامن کمیٹیشن کے سکوت نے غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔

اس کے بعد دوسری بساط لندن میں بچھائی گئی۔ وہاں ہندو، مسلمان، والیان ریاست اور برطانوی نمائندے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جمع ہوئے تاکہ مشکلات پر تبادلہ خیال کریں اور ایک ایسا قابل عمل دستور مرتب کریں جس سے ہندوستان کی سیاسی امنگیں پوری ہوں اور برطانیہ کے مفادات اور ذمہ داریوں کے ساتھ ان کا تطابق ہو جائے۔ اس کانفرنس نے جس کا نقطہ نظر اعلیٰ محنت زبردست اور لگن سچی اور مسلم متی حیرت انگیز جوش اور اہمیا کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تاریخ کا کوئی نیا باب شروع نہ کر سکی۔ البتہ کچھ کچھ کامیابی اسے ضرور ہوئی۔ وفاق اس شرط کے ساتھ کہ اس کا عملی نفاذ اسی صورت میں ہو گا جب کہ ریاستوں کی ایک مقررہ تعداد بھی اس میں شامل ہو جائے، ہندوستان کے مطمح نظر کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ صوبوں کو فوراً حکومت اختیار می دے دی گئی، اور دو عملی (DIARCHY) حکومت ختم کر دی گئی +

یہ سب کچھ ہوا، لیکن ہندوستانی مسئلہ کی جان منرقہ دارانہ سوال تھا۔ اس سلسلہ میں کانفرنس کا کام مایوس کن بلکہ دل شکن ثابت ہوا۔ مسئلہ کے حل کے تمام ممکنہ ذرائع پر غور کرنے کے لئے ایک امتلیتوں کی کمیٹی مقرر کی گئی۔ مسلمان پنجاب اور بنگال کی مقننہ میں ایک ایک نشست زیادہ مانگتے تھے اور اس کے معاوضہ میں مشترکہ انتخاب قبول کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن دوسری راؤنڈ ٹیبل کے ہندو اور سکھ نمائندوں نے ان کی پیش کش مسترد کر دی۔ یہ ایک ایسی حماقت تھی جس کی تلافی مشکل سے ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی پیش کش منظور کر لی جاتی تو آج ہندوستان کی تاریخ ہی دوسری ہوتی۔ مسٹر گاندھی کانگریس کی طرف سے پورے اختیارات لئے ہوئے اس کانفرنس میں موجود تھے لیکن آخر میں انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ میں فرقہ دارانہ مسئلہ کا متفقہ حل ڈھونڈنے میں بری طرح ناکام ہوا ہوں۔ تاہم انھوں نے اس پر زور دیا کہ فرقہ دارانہ سمجھوتے کے انتظار میں دستور سازی کا کام بند نہ کیا جائے اور جب دستور بن جائے تو فرقہ دارانہ سوال ایک عدالتی ٹری بیونل (ثالثی) کے سامنے رکھ دیا جائے۔ مسلمان، پست اقوام اور دوسرے عناصر کانگریس کے خلاف متحد ہو گئے اور آپس میں "امتلیتوں کا معاہدہ" کر لیا اور "جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب" اور "وزن نمائندگی" کے لئے لڑنے کی ٹھان لی۔ آخر میں حکومت نے امتلیتوں کی نمائندگی کی ایک عارضی اسکیم تیار کی اور اگست ۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں وزیر اعظم انگلستان نے کمیونل اوارڈ کے نام سے اس کا اعلان کیا۔

جہاں تک پست اقوام کا تعلق ہے "معاہدہ پونڈ" (POONAPACT)

۱۲ WEIGHTAGE یعنی تناسب تعداد سے زیادہ نمائندگی

۱۲ COMMUNAL AWARDS فرقہ دارانہ پٹوارہ

۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کی رو سے کیونل اوارڈ میں ترمیم کی گئی۔ اور یہ تحریک بھی پیش کی گئی کہ کیونل اوارڈ کی بجائے ایک فرقہ دارانہ مجموعہ بنا کر لیا جائے چنانچہ پنڈت مالویہ کی صدارت میں ایک اتحاد کانفرنس منعقد کر کے اس کی کوشش بھی کی گئی، لیکن یہ کانفرنس بھی ناکام رہی اور اس کی ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی پارٹی، نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے قائم ہو گئی جس نے کانگریس کے نقطہ نظر کی مخالفت میں جو کیونل اوارڈ کو ”قلمبانتی تھی“ اور نہ رد کرتی تھی اس کی مخالفت کو اپنا مقصد قرار دیا۔ ہندو مہاسبھانے بھی اسی اوارڈ کی مخالفت میں اپنا پلیٹ فارم قائم کیا لیکن اس کا سارا نقطہ نظر محض یہ تھا کہ ہندوؤں کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔“

کانگریس ۱۹۳۵ء کی اصلاحات سے ذرا بھی خوش نہ تھی۔ اگر ایک طرف لیگ صوبہ واری خود اختیاری کو آزما دیکھنا چاہتی تھی تو دوسری طرف کانگریس نے صرف دستور کو ”نیا میٹ“ کرنے کے لئے انتخابات لڑنے کا تصفیہ کیا۔ انتخاب میں کانگریس کو ”اس“ اور ”بیس“، بہار، بونہ، پی۔ صوبہ، سرحد، سی۔ پی، اور بہار میں اکثریت حاصل ہوئی۔ حسب دستور کانگریس کو وزارتیں بنانے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے یہ وعدہ کر لیا جائے کہ عملی طور پر گورنریا گورنمنٹ ”تحفظات“ کو استعمال نہ کریں گے مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ اس مطالبہ کا فٹنہ، یہ ہے کہ ان کی ضرورت کے موقع پر بھی تحفظات استعمال نہ ہوں۔ گورنروں نے پہلے تو امتلیتوں کی وزارتیں بنائیں، پھر کانگریس کو یقین دلا یا کہ چھوٹے موٹے اور روزمرہ کے معاملات میں تحفظات استعمال

نہوں گے اور آئندہ میں ان عارضی وزارتوں کی جگہ کانگریسی وزارتیں بن گئیں
اب کانگریس نے اپنی ”رابطہ عوام“ (MASS CONTACT) دلی
سٹرک مشروع کر دی جس کے بارے میں یہ سمجھا گیا کہ کانگریس دیہاتوں کے
مسلمانوں پر کانگریسی رنگ چڑھانا چاہتی ہے چنانچہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت
کی اور پے درپے کئی ضمنی انتخابات جیتے۔ کانگریس نے محسوس وزارتیں بنانے
سے انکار کر دیا اور خالص کانگریسی وزارتیں قائم رکھیں۔ اس کا مطلب یہ
سمجھا گیا کہ کانگریس انتظامی طاقت اور انتظامی مشینری کی اجارہ دار
بننا چاہتی ہے۔

یہ تھے وہ نفسیاتی اثرات جو کانگریس کی بعض سرگرمیوں کی وجہ سے
پیدا ہوئے۔ اصولی طور پر اور جماعتی طریقہ حکومت، پارٹی سسٹم کے نقطہ
نظر سے دیکھا جائے تو کانگریسیوں پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا لیکن اس
میں شک نہیں کہ اخلاقی اور منسلکی نقطہ نظر سے انہوں نے بہت بڑی
فطلی کی۔ انہوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ ہر پارٹی حکومت میں لازمہ کی
حیثیت رکھتا ہے اور ہیلی فیکس (HALIFAX) کے اس قول کی ایک مثال
ہے کہ ”بہترین پارٹی قوم کے خلاف ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے۔“ کانگریس کو
اپنا دیہاتی مورچہ زبردست بنانے کی جو فکر ہوئی وہ اس وجہ سے کہ ان کے
فرہنگوں پر تیسرے فرق کا ہوتا سوار تھا اور جو کچھ مال انہیں ملتا تھا تیسرے فرق
ہی سے مل سکتا تھا۔ اسی لئے انہوں نے دوسری پارٹی کی رضا جوئی
کو ضروری نہ سمجھا ان کا ارادہ تھا کہ تیسری پارٹی پر چھا جائیں اور اسی
نیت سے کانگریس نے مال وصول کرنے کی ٹھان لی۔

DELIVERY OF GOODS یعنی اختیارات حکومت کی وصولی ۱۲۔ مترجم

”اگر برطانیسی حکومت یہ جان لے کہ ملک میں کوئی ایک پارٹی اتنی مضبوط ہے جو ان سے مال وصول کر سکتی ہے تو وہ کسی متفقہ سمجھوتے کا مطالبہ نہ کرے گی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کانگریس میں آج اتنی طاقت نہیں ہے۔ اس نے اپنی جو کچھ حیثیت آج بنائی ہے وہ مخالفت کے باوجود بنائی ہے۔ اگر وہ کمزور نہ پڑ جائے اور صبر سے کام لے تو اتنی طاقت پیدا کر سکتی ہے کہ مال وصول کر سکے“

صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کا جو مخالفت قومیت ردیہ رہا اس نے ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ کانگریسی راج ان پر ظلم و ستم توڑ رہا ہے۔ ان کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ مسٹر جناح نے یہ مطالبہ کیا کہ کانگریس کے ”منظالم“ کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے، لیکن حکومت نے اسے منظور نہ کیا، مسلم لیگ کی طرف سے پیر پور رپورٹ“ اور شریف رپورٹ“ شائع کی گئیں جن میں ان مظالم کی فہرست دی گئی تھی۔ ہمیں ان رپورٹوں سے بحث نہیں ہے، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ ایک قابل غور واقعہ ہے کہ جب کانگریسی وزارتوں نے استعفیے دیئے تو مسٹر جناح کے حکم سے سارے ہندوستان میں توہم نجات“ منایا گیا۔ یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اقلیتوں والے صوبوں کا خصوصاً یو۔ پی اور بہار کا مسلمان پاکستانی عقیدے کے اظہار میں سب سے زیادہ بلند بانگ ہے، حالانکہ اسے اس سے نقصان ہی پہنچ سکتا ہے، فائدہ نہ ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریسی وزارتوں کے قابل شرم دور

سے ایسے ہو کر ہی مسلمان بے تحاشا ہندوستان کی باقائدہ ریاستوں میں تقسیم کے غار کی طرف دوڑ پڑے۔

(د) جماعتی حکومت ہندوستان کے لئے غیر موزوں ہے

اصل میں صوبوں میں کانگریسی انتظام حکومت ہی کو دیکھ کر مسلمانوں کے دل میں یہ شبہ قائم ہوا کہ اس قسم کی جمہوریت جیسی کہ برطانیہ سے یہاں آئی ہے، یعنی پارٹی سسٹم، ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کچھ ہندوستان ہی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ بات عام طور پر بھی درست ہے۔

یہ بات ہم سب کو تسلیم کرنی چاہیے کہ پارٹیاں جمہوریت کا ایک لازمی ذریعہ ہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ ذریعہ ہی مقصد قرار پا جائے چنانچہ جب انتخاب کنندگان پارلیمنٹیں اور کابینہ۔ یہ سب کے سب مختلف طریقوں سے پارٹیوں کی ضروریات کے نتائج اور محکمے زیر اثر ہو جاتے ہیں تو یہی ہوتا ہے جس طریقے سے، اور جس عمل سے گزر کر ذریعہ مقصد بن جاتا ہے ویسے ہی طریقوں سے جو بھی کُل قرار دے لیا جاتا ہے اور وہ حیثیت اختیار کر لیتا ہے جسے آج کل ”کُل“ یا ”کُلّی“ کہا جاتا ہے۔

جمہوریت کے بنیادی اصولوں سے، جو دراصل اخلاقی بھی ہوتے ہیں کسی کہ اختلاص نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہماری ضرورتوں کے لئے جمہوریت جب ہی موزوں ہو سکتی

ہے جب کہ اس کی بعض شکلیں تبدیل کر دی جائیں۔ انیسویں صدی کے دوسرے عشرہ میں پارلیمنٹوں کو سربراہی کا علاج سمجھا جاتا تھا، اب یہ مان لیا گیا ہے کہ وہ کچھ برائیوں کی جڑ بھی ہوتی ہیں۔ اگر ناکام نہ سہی تو کم از کم بیمار جمہوریتوں کی پیدا کی ہوئی قوتوں کی روک تھام کے لئے ایک عالمگیر جنگ تو پہلے لڑی جا چکی ہے، اور دوسری اب جاری ہے۔ اب بھی اکثر ملکوں میں جمہوریت صاحب جائداد و وٹروں کا ڈھکوسلا ہے۔ عوامی جمہوریت ابھی پردہ علم میں ہے، اور جب وہ جنم لے گی تو ہمیں امید ہے کہ معدودے چند افسر اور کو بر سر اقتدار لانے کے لئے ووٹ دینے کی بجائے حتی الوسع سب آدمیوں کو روٹی دلانے کے لئے ووٹ کا استعمال کیا جائے گا۔ یورپ کی سربراہ اور وہ جمہوریتوں کا فرض ہے کہ وہ اسی نتیجہ کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے جمہوریت کی پوشیدہ قوتوں کو برسر کار لانا ہوگا اور دور بینی سے کام لینا ہوگا۔

”دنیا کے بدلے ہوئے حالات کی مناسبت سے جمہوریت کے مسئلہ پر بھی دوبارہ غور و خوض کی ضرورت ہے۔ جمہوریت مکمل اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب زندگی کے اقتصادی، سماجی اور دوسرے پہلو بھی اس کے حلقہ افریں آجائیں۔ سچی جمہوریت کی نظر میں ہر انسان جو دنیا میں آتا ہے کچھ نہ کچھ پیدائشی حق ضرور رکھتا ہے۔ یعنی صحت، طاقت عقل، گوناگوں تقریحات اور آزادانہ دل چاہیوں کا پیدائشی

حق اگر وہ سوسائٹی جس میں وہ پیدا ہوا ہے جمہوری ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے تو وہ اس کے حق سے اسے محروم نہیں رکھ سکتی، اور نہ اسے دبا سکتی ہے۔

جس طرح نمائندگی کے نظام سے گزر کر کانگریس نے "ایک پارٹی کی حکومت" پر اپنا سارا زور صرف کر دیا، اسی طرح اکثریت کے خوف نے مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کی بجائے "دو قوموں" کے نظریہ اور پاکستان کی طرف بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ جب مسلمان پاکستان مانگتا ہے تو وہ گویا خود اپنے واسطے اکثریت کی حکومت طلب کرتا ہے، اور اس سے بھی عجیب تر یہ کہ پاکستان سے گزر کر وہ ہندوؤں کے ساتھ یہ معاہدہ کرنا چاہتا ہے کہ دونوں مل کر انگریز پر حملہ کر دیں۔

"آخر ملک یہ مطالبہ کیوں نہ کرے کہ "مل جاؤ اور انگریز کو نکال باہر" کرو؟ اگر ہم ایک متحدہ ہندوستان کی حیثیت سے طاقت حاصل نہیں کر سکتے تو ہمیں چاہئے کہ غیر متحدہ ہندوستان کی حیثیت سے اسے حاصل کریں۔"

(د) تعطل کا سبب بے اعتباری

ہندو مسلم اختلافات کے اس پس منظر میں ہمیں ہندوستان اور برطانویہ کے مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔ اس مسئلہ نے بھی ایک قسم کی پریشانی اور خوف

GULIAN HUXLEY ON LIVING IN A REVOLUTION

۵۵ ستمبر تا ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۶ء - مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۳ء

پیدا کر دیا ہے :-

سلطنت کے بطن سے ہمیشہ نئی ریاستیں پیدا ہوتی رہی ہیں،
لیکن پرانے زمانہ میں اکثر اولاد مان کو نوچ کھسوٹ لیتی تھی۔ جدید
زمانہ میں سلطنت کو سب سے زیادہ فکر اس کی ہے کہ اس طرح
کا انتشار اور پراگندگی پیدا نہ ہونے پائے، اور ایسے طریقے ڈھونڈ
نکالے جائیں کہ اپنی سیاست بھی قائم رہے اور ترقی و ترقی ہو،
اور نہ اپنا زوال، مثلاً ہندوستان کے ساتھ سلطنت برطانیہ
کا موجودہ رویہ اسی قسم کا ہے۔^{۱۵}

سلطنت کی شیرازہ بندی اسی وقت قائم رہے گی جب کہ وہ اصول جس نے
یہ سلطنت جیتی تھی سرگرم کار رہے۔ وہ اصول یہ ہے :-

ہندوستان کو برطانوی سیرت (کیرکٹ) نے جیت لیا۔^{۱۶}

ہیگل (HEGEL) کی رائے تھی کہ برطانیہ نے دنیا کو مہذب بنانے کا
مشن اپنے ذمہ لیا ہے، اور اس کا موقع اسے ان روابط سے ملا جو اپنی پھیلتی ہوئی
تجارت کے سلسلے میں اس نے قائم کئے اور جاری رکھے۔ ہندوستان میں
اسے زبردست کامیابی حاصل ہوئی :-

ہندوستانی نوجوان چونکہ ہماری ادبیات کے توسط سے ہم سے
مانوس تھے، اس لئے انھوں نے ہمیں غیر ملکی سمجھنا چھوڑ دیا۔ وہ ہم
ہمارے بڑے آدمیوں کا ذکر اسی جوش و خروش سے کرتے ہیں جیسا کہ ہم^{۱۷}

R. M. MACLVER: THE MODERN STATE

۱۵ مقولہ ایرسن، نقل کردہ مارکوکس آف زٹلینڈ: STEPS TOWARDS INDIAN HOME RULE

۱۶ SIR CHARLES TREVELYAN: POLITICAL TENDENCIES

DIFFERENT SYSTEMS OF EDUCATION IN INDIA

ایک مقالہ جو ۱۸۵۲ء میں پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے پیش کیا

اگر سیاسی ربط و مضبوطی برطانوی ہندوستان پیدا کر دیا، تو کچل
روابط سے جدید ہندوستان وجود میں آیا۔ گوگلے کے پائے کے لیڈر برطانیہ
کی تہذیب آفرین صفات پر کامل عقیدہ رکھتے تھے، لیکن ہوا کا رخ بدل گیا۔ لارڈ
برکن ہیڈ نے، جنھوں نے اپنے سائنس کمیشن کا بائیکاٹ ہو جانے دیا تھا، ہندوستانی
سیاست کاروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:-

”ہندوستانی سیاست کار زیادہ تر مغربی تعلیم کے اسی مذہب کے
سابقہ ہیں جس کی طرف سے وہ آج کل اپنی لغت اور بیزاری کا
ڈھونگ رچاتے ہیں۔“

آخر ہوا کا رخ کیوں بدلا؟ کہاں گوگلے، کہاں گاندھی، اس تبدیلی کی کچھ تو وجہ
ہونی چاہیے۔

یہ وجہ ہمیں ”تعلقات کی تاریخ“ میں ملتی ہے۔ یہ سراسر اسٹیفورڈ کے
الفاظ ہیں جنھوں نے ان واقعات سے جو انھیں درپیش ہوئے سبق حاصل کیا
ہے پچھلے۔ بیس برس کی تاریخ نے جو الجھاؤ پیدا کر رہے تھے انھیں دور کرنے کے
لئے سراسر اسٹیفورڈ نے اپنا مسودہ اعلان اس اپیل کے ساتھ پیش کیا تھا،-
”شاید ابھی کچھ مشکلات درپیش ہوں گی اور وہ اس بے اعتبار

کا نتیجہ ہیں جو پچھلے برسوں میں ہمارے درمیان پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن
میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ماضی کی طرف سے منہ موڑ
لیجیے، میری بلکہ ہماری دوستی اور بھرپور دوسرے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں
لیجیے، اور ہمیں اجازت دیجیے کہ سر دست آپ کی آزادی اور

حکومت خود اختیاری کے قیام اور تکمیل کی خاطر آپ کے ساتھ مل کر کام کریں۔

کرپس سے بھی پہلے، افغانستان کچھ عرصہ سے اس دوستی پر زور دے رہا تھا۔ گورنر جنرل کو جو دستاویز ہدایات بھیجی گئی اس میں ”ہندوستان اور سلطنت متحدہ کی شراکت“ کے نصب العین کو بتا کید بیان کیا گیا تھا۔ لارڈ لن لٹھ گوئے اسی نصب العین سے متاثر ہو کر اپنے مقاصد جنگ کی وضاحت کی تھی (۲۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء) ترقی کے مختلف مدارج میں اس شراکت کو نئے سرے سے ڈھالنے اور نظم و دل کو آنے والے مطمح نظر تک بلند کرنے کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ دومی شریا درجہ دیے جانے کے وعدے بار بار دہرائے گئے ”دسمبر سیمول ہور“ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۹ء ان کی ابتداء لارڈ ارون کے وعدے سے ہوئی تھی۔ لارڈ لن لٹھ گوئی ”اگست دالی پیش کش“ بھی اسی اصول پر تھی۔ مسودہ اعلان جس میں جنگی کامیابی کا وعدہ موجود تھا۔ اب تک اس سلسلہ میں حریت آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وعدہ بھی تک ساقط نہیں ہوا ہے۔ وہ ساقط نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساقط ہونے یا اس میں کتر پوریت کی جگہ ہرگز نہ دی جائے وعدہ تو زندہ اور قائم ہے۔ لیکن باہمی اعتماد اور معاہدہ میں کافی جان نہیں ہے۔ اور اگر حالیہ تعلقات کی تاریخ کے متعلق ہندوستان کا نقطہ نظر برطانیہ پر بھر دسہ کرنے میں مانع ہے، تو اُدھر برطانیہ نجات دہندہ اور مالک سلطنت ہونے کی متضاد روایتی حیثیتوں کی وجہ سے ہندوستان کے دعوے آزادی کی حمایت صرف ادھورے دل سے کرتا ہے۔ ہندوستان

۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو وزیر منظم نے یہ اعلان کیا کہ مسودہ اعلان میں جو عام اصول پیش کئے گئے تھے

وہ اپنی دوسری وسعت اور صداقت کے ساتھ اب بھی ”ناج برطانیہ اور پارلیمنٹ کی طے شدہ پالیسی کی حیثیت رکھتے ہیں“ ۱۲

کو جو اندیشہ ہے وہ "تاریخ مابعد کی چمک" کے نامبارک الفاظ میں بیان کیا گیا تھا، اسی طرح سے انگلستان کا اندیشہ ویسے ہی نامبارک الفاظ میں سلطنت کاٹاٹ اٹنا سے ظاہر کیا گیا۔ قومی ریاستوں کی اصلاح کی واحد صورت ایک ایسا بین الاقوامی نظام ہے جس میں کسی قوم کی آزادی سے کوئی دوسری قوم کمزور نہ ہونے پائے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے برطانیہ کو نقصان پہونچے، بلکہ دوسری دُوی بینوں کی طرح ہندوستان کی ترقی سے دولت مشترکہ کو فائدہ ہی پہونچنا چاہیے۔ اگر ایک "کل" کی آزادی کو اس کے اجزائے ترکیبی کی آزادی سے تعوییت نہ پہونچی تو اٹلانٹک چارٹر نقش بر آب ثابت ہوگا اور "چار آزادوں" کا بھی وہی حشر ہوگا جو چودہ نکات کا ہوا۔

(دو) بے اعتباری کا سبب

غرض کہ بے اعتباری کی وجہ سے (ہندوستان اور برطانیہ) گفت و شنید ختم ہوگئی۔ لیکن بے اعتباری تو صرف علامت ہوتی ہے۔ اچھی کا سبب کیا ہے؟ یہ سبب آپ کو زیادہ تر اس کارروائی میں ملے گا جو سرکاری طور پر ہندو مسلم مسئلہ کے بارے میں کی گئی۔ اس مسئلہ کو جس طرح ہاتھ میں لیا گیا اس سے صمیم ہو یا غلط، یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ برطانیہ فرقہ دارانہ مشکلات کو بہانہ بنا کر ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کی ترقی روکنا چاہتی ہے۔ برطانیہ کی طرف سے یہ احتجاج کیا جاتا ہے :-

لے POST-DATE CHEQUE کرپس پیش کش کے متعلق مسٹر گاندھی کا جملہ ۱۲۔ مترجم

مسٹر چمپل کے الفاظ ۱۲ مترجم

عدا اگر راستہ میں مشکلات پیش آئیں تو ان کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ مشکلات اس برصغیر (SUB-CONTINENT) میں طبقوں اور فرقوں کی بے شمار تقسیموں میں مضمر ہیں۔ ۱۔ دوسری طرف سے کانگریسی ہندوستان یہ احتجاج کرتا ہے:-

عدا برطانوی حکومت اور اتحادی مقصد دونوں کے لئے بھی بہتر ہو گا کہ اقلیتوں کے سوال سے زود دقیق دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس قسم کا احتجاج مسٹر جناح نے بھی دوسری رائڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد کنگ کالج کے سنٹرل تھیٹر میں مارچ ۱۹۳۷ء میں اپنی تقریر میں کیا تھا:-
 ”اور بار بار ہندو مسلم سمجھوتے کے سوال کو اچھال کر صورتِ حالت کو اور بدتر بنایا جاتا ہے..... میں آپ سے سچے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایک ایسے مسئلہ کے متعلق ہم اس وقت تک کسی قسم کا سمجھوتا کر سکتے ہیں جبکہ اسکے پیچھے کوئی سند جو از نہ ہو یا تصفیہ کے بعد اس کی پابندی کرانے کے لئے کوئی وسیلہ موجود نہ ہو..... اور ایک مرتبہ پھر میں برطانوی پبلک سے سوال کرتا ہوں کہ جب آپ خود ہجری مصلحتوں کے پریشان کن ہول کو حل نہیں کر سکتے تو ہندوستانی فرقہ وارانہ مسئلہ کا ذکر آپ کس منہ سے کرتے ہیں؟“

بجاطور پر ہو یا بے جا، جب تک ملک میں ہندو مسلم مخالفت جاری رہے گی، برطانیہ کے خلاف احساسِ ضرور موجود رہے گا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ برطانیہ نے فرقہ وارانہ مشکلات حل کرنے میں ہندوستان کی مدد کی ہے وہ ایک اور صفحہ ایک ہی ثبوت پیش کر سکتا ہے:-

مہم اس بارے میں اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ ہم نے کمپوزل اوارڈ دیکر اس کا ثبوت دے دیا۔ اگر اس وقت ہماری نیت پھوٹ ڈلو کر فتح حاصل کرنے کی ہوتی تو ہم ہندوستانیوں سے کہہ سکتے تھے کہ:-

”جاؤ پہلے اپنی فرقہ وارانہ مشکلات حل کرو، جب تک تم انکا تصفیہ نہ کرو

لوگ، کوئی دستوری ترقی نہ ہو سکے گی۔“

خیر کچھ ہوا، ہوا۔ لیکن حالیہ گاندھی جیل گفٹ و شنید کے ٹوٹ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ جب تک باہر سے مدد نہ ملے اور دوسرے لوگ ہندو مسلم مسئلہ کے حل میں دلچسپی نہ لیں، یہ سوال حل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ برطانیہ اپنے موجودہ منہی (بے تعلقی) کا رویہ کو زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رکھ سکتا خود اپنے فائدہ کیلئے، ہندوستان کے فائدہ کے لئے اور ہن عالم کے مفاد کی خاطر برطانیہ کو اس کام میں اپنا حصہ لینا چاہیئے، اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حصہ ایک اور فیاضانہ اور ثالثی کے اوارڈ کی شکل میں ہو۔ اگرچہ برطانیہ ہندوستان پر کوئی سمجھوتہ جبراً نہیں ٹھونس سکتا لیکن سمجھوتہ کی ضابطہ کیا کر سکتا ہے اور اسے یہ کرنا چاہیئے بلکہ اسے خود ایک سمجھوتہ مرتب کرنے میں پہل کرنی چاہیئے۔ اخباری اطلاع کی بموجب مٹر جارج گبس (GEORGE GIBBS) صدر ٹریڈ یونین کانگریس نے ڈومی نیوں اور ہندوستان کے اخباری نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ کہے تھے:-

”اگر برطانیہ نے ہندوستانی مسئلہ حل نہیں کیا تو اس کی سلطنت کا

شیرازہ بکھر جائے گا برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ صحیح حل معلوم کرنے کے

بارے میں ہندوستان کی مدد کرے اور محض یہ کہہ کر وجہ تک

تم میں اتفاق نہ ہو ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے۔^۱
 سروالٹر لےٹن (SIR WALTER LAYTON) نے تو یہاں تک کہہ دیا
 کہ جب تک ہندوستان میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو عالمی نظام قائم کرنے کا کام اگر ناممکن
 نہیں تو بہت زیادہ دشوار ثابت ہو گا۔^۲

بعض حلقے سختی سے اس خیال پر قائم ہیں کہ ہندوستان میں برطانیہ
 کی طرف سے نیک خیالی اور خیر سگالی کی جو کمی پائی جاتی ہے اس کا ہندوستانیوں
 کے آپس کی عداوتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل اسی خیال کی وجہ سے
 یہ دونوں ناسور بہہ رہے ہیں اور وہ ساتھ ساتھ ہی نہیں بہتے بلکہ یہ ایک دوسرے
 کے اندر بہہ رہے ہیں۔ اس صورت حال کی خصوصیت کا تقاضہ ہے کہ ان دونوں
 مسائل کو حل کرنے کے لئے ان پر عملِ حل کر اور سامنے کے رخ سے ہلے کیا جائے۔
 ”اگر ہم میں دستور اور رواج کو چھوڑ دینے کی ہمت پیدا ہو جائے تو
 تو شاید ہم اب بھی ہندوستان میں اندرونی اتفاق و اتحاد اور دولت مشترکہ کے
 اندر برطانیہ اور ہندوستان کا اتحاد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔“^۳
 ہندوستان کے سوال کو اپنا سوال سمجھنا برطانیہ کے لئے بھی انتہائی مفید
 ہے جتنا کہ ہندوستان کے لئے۔

”ہمیں اتفاق اتحاد اور سیاسی اور ذاتی مناقشوں کو بند کر دینے
 کی طرح تائید کرنا ہے۔ ہمنیشنلسٹوں (قوم پرستوں) سے کہتے
 ہیں۔ ”ان چیزوں کو چھوڑ دو اور جنگ کے زمانہ میں آپس میں مل کر
 مشترکہ خطرے کا مقابلہ کرو۔“ ہم ان سے یہ کیسے امید کر سکتے ہیں
 کہ وہ ہماری اس بات پر لبیک کہیں۔ آگے کا راستہ اتنا آسان

نہیں ہے جتنا کہ انگلستان کا خیال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان خود اپنے میں وہ اتحاد پیدا کر سکے جو لازمی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اس آزادی پانے سے محروم نہیں کر سکتی جس کا وہ آرزو مند ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اس کی قوت اور اتحاد کی تشکیل میں جو کچھ ہم سے بن پڑے کریں۔ تب ہندوستان کچھ لیگا کہ ہمارے گروہ کے ساتھ منسلک رہنے میں خود ہی کا فائدہ ہے۔

لیکن برطانیہ میں جو مسلک سیاسیات آج برسرِ اقتدار ہے وہ اب بھی اس مطالبہ پر اڑا ہوا ہے کہ ہندو مسلم ال، ہندوستانی برطانوی سوال سے بالکل غفلت اور ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دونوں مسائل جس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہرگز مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ وہ گروہ جو ان دونوں مسائل کو ایک دوسرے سے ملوہ سمجھتا ہے یہ توقع کرتا ہے کہ ہندو مسلمان آپس میں تو غیر متحد اور غیر متفق رہیں لیکن برطانیہ کے ساتھ اتفاق و اتحاد رکھیں۔ یہ کرب انسا مابعد الطبیعیاتی ہے کہ ہندوستان باوجود اپنے مشرقی شوق تجرید کے اسے دکھا نہیں سکتا۔ علم الامراض کے قوانین کی رو سے بھی وہ ناممکن ہے۔ کسی عضو یہ کے اندر اگر کوئی زہریلا کرکڑ پیدا ہو جائے، تو موقع ملنے پر وہ دوزخ تک سرایت کر جاتا ہے ہدیت سیاسیہ کا وہ زہر جو ہندوستانیوں کے آپس کے تعلقات خراب کر رہا ہے آسانی سے پھیل جاتا ہے اور ہندوستانی برطانوی تعلقات کی جڑ تک سرایت کر جاتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ آپس کی عداوتوں کی بنا پر حقیقی ہے یا خیالی، بجا ہے یا بیجا لیکن اگر وہ موجود ہے اور اپنا کام کر رہی ہے تو اس کی روک تھام ضروری

ہو جاتی ہے۔ اگر نقطہ نظر صحیح ہو گیا تو یہ بنا بھی خود بخود غائب ہو جائے گی

ن) بعض دماغی گتھیاں اور ان کا علاج

ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے کسی نہ کسی طرح یہ سمجھا شروع کر دیا کہ جو کچھ طاقت بھی ان کی طرف منتقل ہوگی وہ گویا برطانیہ کی طرف سے ایک طرح کا ہدیہ ہوگا۔ خواہ وہ سیر فریق ”چھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کے جرم کا مجرم ہو یا نہ ہو، لیکن مرکز ثقل اسی کے اندر موجود ہے اور دانستہ یا نادانستہ دونوں فریقوں میں ایک طرح کی رقابت ہو گئی ہے اور وہ تیسرے فریق کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی کوتاہی کرے۔ محکوم اقوام میں جو پست اخلاقی پیدا ہو جاتی ہے وہ تو خیر ہے ہی، لیکن اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے اور وہ تیسرے فریق کی اس حیثیت میں مضمر ہے کہ بقیہ وہ فریقوں پر اقتدار کی ساری ڈوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب اکبر کی حکومت تھی اور ملک میں اتفاق کا راج تھا تو تیسرے فریق کی یہ دماغی گتھی یا ہوا موجود نہ تھا، حالانکہ اکبر کے عہد میں اگر اس قسم کی شورش ہوتی تو اسے ہرگز گوارا نہ کیا جاتا۔

تیسرے فریق کے متعلق اس ذہنی گتھی میں ایک اور گتھی، یعنی تاریخی گتھی کی وجہ سے اور زیادہ الجھن پیدا ہو گئی ہے بعض مؤرخین ایک باقاعدہ پروپیگنڈا کے تحت جب کبھی مسلمانوں کے دور کا ذکر کرتے ہیں تو اسے تاریخ ہند کے ”تاریک دور“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر انگریزی راج کو ہندوؤں میں مقبول بنایا جائے۔ لیکن محض تاریخ کو از سر نو لکھنے سے کام نہ چلے گا۔ یہ احساس پیدا کر لے کیلئے کہ ملک میں اتفاق اور اتحاد جو

ہے ایک ایسی تنظیم پیدا کرنی ہوگی جو سارے ملک پر عادی ہو۔ ہر نقطہ نظر سے عوام کے ذہن پر ایک عظیم الشان تبدیلی یعنی اس احساس کا کہ اتحاد کارفرما ہو کر رہے گا حرکت آفریں اثر پیدا کرنا ہوگا۔

اس تنظیم کا کام یہ ہوگا کہ وہ لوگوں میں اس بات کا یقین پیدا کرے کہ اب عملی کام ہوگا تاکہ ہر طرف فکر و خیال میں حرکت پیدا ہو جائے اور لوگ عملی تدبیروں پر غور کرنے لگیں۔ آج کل ہر طرف ایسی حیران کن اور مبہم گفتگو جاری ہے کہ اصل مطلب کا سمجھنا دشوار ہو رہا ہے۔ ہر گروہ اپنی شکایات کو مختلف الفاظ میں بیان کر رہا ہے، جو اکثر ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں معقول اعتراضات کا جواب دینا ہی کافی نہیں ہے۔ غیر معقول اعتراضات کا جواب بھی ضروری ہے اس نکلان سے بھی فساد پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیا بات ہے جس سے لوگوں کا رویہ اس قدر غیر معقول ہو گیا ہے، یہ مشکل حل نہ ہو سکے گی۔

غرض کہ اصل مسئلہ اب یہ ہے کہ سارے ملک میں رائے عامہ کا جائزہ لیا جائے اور ہندو مسلم سوال کی باضابطہ اور اصولی تحقیق کے لئے مواد فراہم کیا جائے کام یہ ہوگا کہ رائے معلوم کی جائیں، تبادلہ معلومات ہو، تردیدات کو واضح کیا جائے، مختلف نقطہ ہائے نظر کو گوشوارہ کی شکل میں مرتب کیا جائے غیر ضروری باتوں کو حذف کر دیا جائے، نزاعی مسائل کو جتنی الوسع کم کیا جائے۔ مطالبات میں معقولیت پیدا کی جائے اور ایسے مشترکہ سمجھوتے کیے جائیں جو قابل عمل بھی ہوں۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جس میں علاوہ ان باتوں کے جو اس مقالہ کے آخری باب میں بیان ہوئی ہیں حکومت کو پہل کرنی چاہیے۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارے سامنے جو سوال ہے وہ حد سے زیادہ پیچیدہ ہے

لیکن اس سوال کی روح و فوج کا سوال ہے یہ مسئلہ اصل میں باہمی تعلقات بالفاظ دیگر ذہنوں کا مسئلہ ہے۔ صرف سیاسی انجینیری سے دماغی مشینری نہیں چل سکتی، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یورپ میں اقلیتوں کے سمجھوتے کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے، میکلائٹی نے اپنا بنیادی مفروضہ، ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

”اگر ذہنیت کی اصلاح ہو جائے تو (سمجھوتے کی) مشینری بہت جلد معلوم کر لی جائے گی۔“

بدقسمتی سے یورپ کی ناکامی سے ہمیں اب تک یہ سبق حاصل نہیں ہوا ہے کہ علاج اس وقت تجویز کیے جاتے ہیں۔ یعنی معاہدے اور فی صدی تناسب۔ وہ کہتے ہوئے ہیں ہمارے پاس کچھ اپنے دیسی علاج بھی موجود ہیں لیکن ہم ان کی ناقدری کرتے ہیں اور انہیں چھوٹے چھوٹے علاج کہتے ہیں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ صوفیوں اور بھگتوں کی سوانح اور تعلیم کے اثر سے یہ دونوں فرقے نازک سے نازک حالات میں ایک دوسرے کے نزدیک اور ملاپ اور محبت کے ساتھ رہ رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ بے شک بدل گیا ہے، لیکن بنیادی اصول زمانہ کے ساتھ نہیں بدلا کرتے

خواہ ہندو مسلم تعلقات کا سوال ہو، یا ہندوستانی برطانوی تعلقات کا اسکا حل انسانوں کے ذہنوں اور دونوں فرقوں کی ردحوں میں تلاش کرنا ہوگا۔ کوئی سیاسی فارمولا طلسماتی علاج ثابت نہیں ہو سکتا۔ کم از کم ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اب تک سیاسی سمجھوتوں اور دستوری فارمولوں کے جو فوری علاج تجویز کیے گئے وہ سب سبنا کام ہیں یہ اعتراف کسی شدید کمزوری کی دلیل نہیں ہے سول یہ ہے کہ وہ کیوں ناکام رہے؟ سر اسٹیفورڈ

نے اس طویل داستان کو ایک جلد کے اندر سمو دیا ہے۔

”زمانہ گزشتہ کی بے اعتباریاں اتنی شدید ہیں کہ انہوں نے زمانہ

حال میں بھی سمجھوتا نہیں ہونے دیا۔“

لوگوں کو اس سے پہلے ہی سنجیدہ الفاظ میں متنبہ کیا جا چکا ہے: ”ایسی رکاوٹیں بہت کم ہیں جو خیر سگالی اور تعاون سے دور نہ ہو سکیں“ یہ اس پیغام کے الفاظ ہیں جو ہنر ایل بائی بس ڈیوک آف گلوسٹر، ملک معظم کی طرف سے ہندوستان لائے تھے۔ اس پیغام میں آگے چل کر تاکیداً بتایا گیا تھا کہ جلد متعلقہ اشخاص کے سامنے جو کام ہے وہ یہ ہے کہ ”بے اعتباری سے پیدا ہونے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے“ لیکن شاید اس وجہ سے کہ خیر سگالی کے الفاظ کو عام طور پر محض زور فصاحت سمجھا جاتا ہے یا پھر شاید اس وجہ سے کہ ارباب نظم و نسق کو بہت زیادہ تخیل سے کام نہ لینا چاہیے، اس تنبیہ کے باوجود کوئی اہم اعتبار آفریں مشینری پیدا کر کے کسی قسم کی خیر سگالی کی ہم شروعات نہیں کی گئی۔ ایسے حالات میں اگر کرپس کی تجاویز، جن کا تصور اس قدر اعلیٰ اور شریفانہ تھا، بے حس کاغذ اور ان کا مشن بے نور آنکھوں پر کوئی اثر نہ کر سکا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ سب سے سمجھتا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس کے بغیر امن اور ترقی ناممکن ہے لیکن جب تک پھول (ثقافتی) مفاہمت نہ ہو یہ سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ جب تک دماغی پس منظر دھندلا ہے سیاسی منزل مقصود کا پرتو اس پر نہیں پڑ سکتا۔

اگر کسی اعلیٰ درجہ کے فارمولا سے کام چل سکتا تو میں پھر کہتا ہوں، ”سر اسٹیفورڈ کرپس کے لائے ہوئے فارمولے سے بہتر اور کوئی فارمولا نہیں

ہو سکتا تھا۔ کرپشن مشن کی ناکامی سے یہ چیز واضح ہو جاتی چاہیے تھی، کہ
 سردست ملک کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ خیر سگالی اور اعتبار کے سرمایہ
 کو از سر نو فراہم کیا جائے۔ یہ گہنا درست نہیں ہے کہ چونکہ ہندوستانی
 سیاسی تربیت سے عاری ہیں اس لئے وہ مسودہ اعلان کو نہ سمجھ سکے
 خود یورپ کا کیا حال ہے، جہاں قومیں ایک فارمولے کے بعد دوسرا فارمولا
 پیش کرتی ہیں اور ناعاقبت اندیشی سے ایک جنگ کے بعد دوسری
 جنگ میں الجھ جاتی ہیں۔ دماغی علاج ہی اس وقت ساری دنیا کی اشد
 ضرورت ہے +

اگر ہم میں سمجھوتے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو اس (سمجھوتے) کی مناسب
 دفعات کی ترتیب میں بھی ہمیں کامیابی ہو سکے گی۔ ہماری اصلی کوشش
 یہ ہونی چاہئے کہ نفسیاتی مورچہ پر ایسی لڑائیاں لڑیں جن میں ہم ایک دوسرے
 کو جیت لیں۔ اگر یہ ہو جائے۔ یعنی مشبہ مٹ جائے اور اثر قبولیت پیدا
 ہو جائے۔ تو کوئی فارمولا خواہ وہ کیسا ہی ناقص کیوں نہ ہو فوراً کارآمد
 ثابت ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوا تو چاہے ہم قیامت تک اتفاق اور اتحاد کی
 اسکیں بناتے رہیں، ہمیں کامیابی نصیب نہ ہوگی۔ اگر سیاسی ضابطوں
 ہی سے کام چل سکتا تو انگلستان اور آئرلینڈ میں تو سیاسی ضابطہ
 بانڈوں کی کمی نہ تھی پھر آئرنسٹ میں یہ الم ناک علیحدگی کیوں ہوئی؟
 آئرلینڈ کے ساتھ اتحاد کی ناکامی کی بہترین اور مختصر ترین وجہ
 جو کوئی انجینئر پیش کر سکتا ہے یہ ہے کہ افراد کی طرح قوموں کے تعلقات
 میں بعض غلطیاں ایسی ہو جاتی ہیں جو ناساتلاف تلافی ثابت ہوئی
 ہیں۔

مجھے اس پر ہے، اور میری دعا ہے کہ ہم بھی اس واقعہ سے سبق
 لیں۔ کاکس ہندوستان اور سلطنت متحدہ کے باہمی تعلقات میں اس
 قسم کی ناقابل تلافی غلطیاں پیدا ہوں۔

نواں باب

ایک متفقہ آئین!

جب تک بنیادی طور سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں سمجھوتہ نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی آئین نہیں بن سکتا۔ اب سمجھوتہ کن اصول پر ہو سکتا ہے۔

دراں مسلم لیگ یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم ہو جائے اور اس میں مسلمانوں کی اپنی اس قسم کی ریاستیں ہوں جنہیں حکومت کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ پاکستان کے مطالبہ کا پتھر یہی ہے۔ کانگریس مہا سبھا ہندوستانی عیسائیوں سکھوں۔ آزاد مسلم کانفرنس مسلم مجلس اور بعض دوسری جماعتوں نے ابھی تک پاکستان کے اصول کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگرچہ حال میں مسٹر گاندھی نے اس سے ملتی جلتی ایک پیشکش مسٹر جناح کو ضرور کی تھی۔ لیکن یہ قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پاکستان چاہتی ہے۔

(ب) سر سیٹھوردکریس کے مسودہ قانون کی سفارش یہ تھی کہ وفاق کے اصول پر یونین آف انڈیا ہونی چاہیے۔ عبوری دور کی قومی حکومت کے فوری سوال پر کانگریس نے اس مجوزہ اسکیم کو رد کر دیا۔ اور مسلم لیگ نے اسے اس لئے تسلیم نہیں

کیا کہ اس مجوزہ اسکیم میں پاکستان کی حیثیت زیادہ تر ثانوی اور کم درجہ کی ہے ۔
 (ج) کانگریس ہندوستان کے لئے ایک ایسی واحد حکومت (یونی ٹری
 گورنمنٹ) چاہتی ہے جس کا آئین ایک نمائندہ اور دستور ساز اسمبلی (کانگریس یونائیٹ
 اسمبلی) تیار کرے۔ اور اس دستور ساز اسمبلی کی بنیاد تمام بالغوں کے رائے دینے
 کے حق پر ہو۔ اگرچہ کانگریس نے اپنے تازہ ترین رزلولوشن میں صوبوں کو ایسے
 اختیارات دیئے جانے کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے جن کی آئین میں تصریح نہ ہو
 مسودہ قانون میں بغیر اصول آئین ساز جماعت کے بنانے کے لئے پیش کیا گیا اس اصول کو
 بھی اور دستور ساز نمائندہ اسمبلی کی اس تدبیر کو بھی مسلم لیگ تسلیم نہیں کرتی ہے)

پاکستان !

پاکستان پر اعتراض کرنے والے ابھی تک مسلمانوں کے سامنے ایسی کوئی اور
 مناسب اسٹیم پیش نہیں کر سکے جس سے مسلمان مطمئن ہو جائیں مسلمانوں کی ہی وہ
 جماعت جس کو دُکھ پہنچا ہے جیسا کہ مسٹر گاندھی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ذکر وڑ انسانوں
 نے جس چیز کا پکا ارادہ کر لیا ہو۔ اُس چیز کو ٹالا نہیں جاسکتا۔ اس وقت ہند کے
 ساتھ مسلمان ان شرطوں پر سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے۔ کہ ہندوستان کے شمال مغرب
 میں بھی پاکستان ہو۔ اور ہندوستان کے شمال مشرق میں بھی پاکستان ہو۔
 اور اگر حقیقت میں کوئی عملی سمجھوتہ کی کوشش ہو تو اس میں ان شرطوں کو نظر انداز
 نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان شرطوں کے قبول کرنے میں کچھ ایسی دشواریاں ہیں جو
 حل نہیں ہو سکتی ہیں تو اسی کی بجائے کوئی اور صورت نکالنی اور بتانی ہو گی۔
 بہت ممکن ہے کہ فرقہ پرستی کے مرض کی تشخیص میں آخری اور خطرناک علامت
 پاکستان ہو۔ مگر پھر بھی اس مرض کا علاج کرنا ضروری ہے۔ اس پر غور کیئے بغیر کہ

کس چیز نے مسلمانوں کو اس مطالبے پر مجبور کیا اور اس کی بجائے انہیں کیا دیا جاسکتا ہے؟
اس پاکستان کے مطالبے کو رد کر دینا ایک لغو فعل ہے۔

اگرچہ پاکستان کا وہ تصور کافی روشن اور واضح ہے جس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کے خود بنانے اور سلجھانے کا اختیار ہر قوم کو ہونا چاہیے۔ لیکن جسے افاغیہ لحاظ سے پاکستان کی حیثیت کافی واضح نہیں ہے۔ جہاں تک اس کام کو عملی طور پر کرنے کا سوال ہے۔ پاکستان کے علاقے کا نقشہ بھی ٹھیک ٹھیک اور صاف صاف نہیں بن سکا۔ ابھی تک سات علاقوں کا صرف ایک نقشہ تیار ہوا ہے جس میں سرسکند رحیات خاں ایک وفاقی (فیڈرل) طرفہ حکومت کے تحت نہ صرف برطانوی ہند کے تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں کو بلکہ ریاستوں کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس پلان کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی۔ اور اس پر اتنا غور نہیں کیا گیا جتنا کہ چاہئے تھا اور یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس تقسیم کے کرنے کی کتنی گہری دھن ہے۔ مسلمانوں کو یہ احساس ہے کہ جداگانہ انتخاب کی حفاظتی تدبیر بھی نہ چل سکی۔ لیکن ملک کو تقسیم کر کے سمجھوتہ کر لینے کا معاملہ بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ پاکستان کا نقشہ سامنے موجود نہ ہو۔ پاکستان کے نقشہ پر نظر ڈالے بغیر مندرجہ ذیل سوالات کا آسان حل نہیں مل سکتا۔

- (۱) اگر اپنے سیاسی و معاشی معاملات کے خود بنانے اور سلجھانے کا اختیار کچھ قوم کے لوگ مانگیں تو ان کی حیثیت کیا ہوگی۔ اگر وہ ہندوستان میں رہنا چاہیں تو انہیں اس ملک کا کون سا علاقہ دیا جائے گا؟
- (۲) کیا ہر حالت میں انہلے اور جالندھر کے علاقے پاکستان میں شامل کر لئے جائینگے؟ اگر ایسا ہوا تو کس اصول کے مطابق ہوگا؟

(۳) کیا امرت سرپاکستان میں شامل ہوگا؟

(۴) شمال مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان کیا ہوگی؟

(۵) کیا ان ڈڈپاکستانی علاقوں کو آپس میں ملائے کے لئے کوئی تنگ اور

طویل قطعہ زمین ہوگا۔ اور اگر ہوگا تو اس قطعہ زمین کے بارے میں کیا تجویز ہے؟

(۶) کیا کلکتہ پاکستان سے باہر ہوگا یا پاکستان کے اندر؟

(۷) اگر شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسلمان یہ چاہیں کہ انھیں اپنے سیاسی

و معاشی معاملات کو خود بنانے اور سلجھانے کا اختیار حاصل ہو۔ اور وہ پاکستان

سے باہر رہنے کا فیصلہ کریں۔ تو کیا صورت ہوگی؟

جغرافیائی پہلو سے نظر مٹا کر آب ایسی اور بھی زیادہ زبردست دشواریوں پر

غور کرنے کی ضرورت ہے جو پاکستان کی اسکیم میں نظر آتی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ

کیا حقیقت میں ان دکھوں کی دوا یہی ہے جن سے بچھا چھڑانے کی تدبیر کی جا رہی ہے

یا دوسرے الفاظ میں کیا پاکستان کوئی ایسی عملی تدبیر بتاتا ہے جس سے ان صوبوں

میں جہاں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کا اور

مناسب سلوک ہونے کا انتظام ہو جائے گا؟ یہ بات پاکستان سے کہاں حاصل

ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے ان صوبوں کے مسلمان نہ صرف ہمیشہ کے لئے ہندو

اکثریت کی حکومت کے ہاتھ میں پڑ جاتے ہیں۔ بلکہ ان کے فائدہ سے بھی محروم ہو جاتے ہیں

جو انھیں فرقہ وارانہ تصفیہ کے لحاظ سے حاصل ہے۔ دراصل اس بات کی ضرورت ہے

ان صوبوں میں مسلمانوں کو سنبھالا جائے تاکہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا بگڑی

وزارتوں کے تحت بد نظمی کا سابق دور پھر نہ لوٹ آئے۔ ظاہر صورت میں تو پاکستان

کی اسکیم میں اس مشکل کا حل موجود نہیں ہے۔ پاکستان دو مسلم ریاستیں تو قائم

ضرور کر دیتا ہے لیکن اس مسئلے کا حل پاکستان میں نظر نہیں آتا۔ اب پاکستان

کے مختلف پہلوؤں کو بھی کچھ تفصیل کے ساتھ جانچئے۔

خود مختار مسلم ریاستیں

یہ کہا گیا ہے کہ ایسی خود مختار مسلم ریاستوں کے بن جانے جہاں ہندوؤں کی اقلیت ہو، خود بخود یہ اثر ہو گا کہ ہندو صوبوں میں یا مجموعی طور پر ہندو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ بہتر سلوک ہو گا۔ صلح نامہ و رسائی سے پہلے اور اس کے بعد یورپ میں جو اقلیتیں تھیں ان کی تاریخ سے تو اس بات کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ کیا اپنے سیاسی و معاشی معاملات کے خود بنانے اور بوجھائے کے اصول پر عمل کر کے ہندوستان کو بلقانی ریاستوں کی طرح تقسیم کر دینے سے بہتر نتیجے نکلیں گے؟ تاریخ کے تازہ ترین واقعات کے دیکھنے سے اس سوال کا جواب قطعی طور پر نفی میں ملتا ہے اس کے علاوہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان اور سندھ کی مردم شماری کے نقشوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی صرف باسٹھ فیصدی کے قریب ہے۔ کیا یہ اتنی بڑی اکثریت ہے جس کی بنا پر علیحدگی کا سوال اٹھایا جائے؟ اور جب اقتصادی میدان میں دونوں فرقوں کی اپنی اپنی حیثیتوں پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو بظاہر یہ اکثریت بھی بیکار نظر آتی ہے۔ اگر اس پاکستانی علاقہ میں سے ضلع انبالہ کو نکال کر کشمیر کو شامل کر لیا جائے تب بھی مسلم اکثریت اڑسٹھ فیصدی سے زیادہ نہ ہوگی۔ شمال مشرقی پاکستان میں بھی چونکہ فیصدی سے زیادہ مسلم اکثریت نہیں معلوم ہوتی۔ ان دونوں پاکستانی علاقوں کے درمیان جو میر، نمائے ہندوستان حاکم ہو گا جو شمال میں سات سو میل تک چوڑا ہے۔

یہاں سااشارہ اس طرٹ کیا گیا ہے کہ جو مسلمان باقی ماندہ ہندوستان میں آباد

ہیں۔ وہ اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان میں آجائیں گے۔ یہ تجویز اتنی عجیب و غریب اور نرالی ہے کہ سنجیدگی سے اس پر غور کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور اس پر رائے زنی کیے بغیر اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ چنانچہ خود مسٹر جناح نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ بعض وقت اس کی تائید میں یہ مثال پیش کی جاتی ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی اور یونان کی آبادیوں میں آپس میں تبادلہ ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کو بھلا دیا جاتا ہے کہ یہ معاملہ ان یونانیوں کا تھا جو جا کر اناطولیہ میں آباد ہو گئے تھے اور ان ترکوں کا معاملہ تھا جو حاکم یونان میں آباد ہو گئے تھے۔ اور ہندو اور مسلمان صدیوں سے ہندوستان میں رہتے چلے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہی یاد رکھنا چاہئے کہ اس تبادلے میں تقریباً دس لاکھ یونانی اور تقریباً پانچ لاکھ ترک ایک جگہ سے سکونت چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہوئے تھے۔ اور یونانیوں کو ان لوگوں کے آباد کرنے میں جو دوبارہ ان کے وطن واپس آئے تھے۔ تقریباً ایک کروڑ پونڈ صرف کرنے پڑے تھے۔ ہندوستان میں تقریباً تین کروڑ مسلمانوں کے ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہونے کا سوال ہے۔ اور وہ یہ زبردست کام ہے جسے کسی انسانی وسیلہ سے پورا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان کی حمایت کرنے والے یرغمال یعنی ضمانت کے طور پر آدمی کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے اصول پر آس لگائے ہوئے ہیں۔ اور یہ اصول یہاں کام نہیں دے گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو سیاست کی بنیاد تہذیب و شائستگی نہیں بلکہ وحشت و بربریت ہو جائے گی۔

پاکستان کی اقتصادیات

بہت ممکن ہے کہ جلد وہ زمانہ آجائے جب دنیا کی تجارت میں ہندوستان

اس وجہ سے نہایت ہی اہم ملک بن جائے کہ یہاں سے کوئلہ، پٹرولیم، کچالوہا، کچا منگینیز، مختلف قسم کے جواہرات، کچا کروم، باکسائیٹ، نمک، میگنیشائیٹ، ابرق، جنسپم، مونازائیٹ اور پتھیلوں میں استعمال ہونے والے دوسرے سخت مادے ملتے ہیں۔

آج کل کی دنیا میں صنعتی استعداد اور قوت کی بنیاد تین چیزوں یعنی کوئلے، لوہے اور تیل کی موجودگی پر ہے۔ ان میں سے کوئلہ اور لوہا دو ایسے عنصر ہیں جو مودہ فولادی زمانہ میں ملک کو صنعتی بنانے کے لیے دراصل ضروری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تیل کی بھی بڑی قدر قیمت ہے۔ لیکن تیل ان دونوں کی نسبت بہت کم ضروری ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (جیسا جرمنی میں ہوا ہے) کوئلہ کو سینے والے ایندھن کی شکل میں تبدیل کر جائے۔ لیکن کوئلہ کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ مجموعی مقدار کی قیمت اور تقسیم دونوں پہلوؤں سے ہندوستان میں صنعتی لحاظ سے نہایت اہم اور کانوں سے نکلنے والی چیز کوئلہ ہی ہے اور بہترین قسم کا کوئلہ اور بہت ہی زیادہ مقدار میں یعنی ۹۸ فی صدی سے بھی زیادہ بنگال، بہار اور آسٹ کے صوبوں میں ملتا ہے۔ اس قسم کے کوئلہ کی سب سے بڑی بڑی کانیں جو ہر طرح کے کاموں میں اور عام طور سے استعمال ہو سکے اور خاص طور پر کھانا پکانے کے کام میں لایا جاسکے اور ریل اور سمندر کے راستوں سے لاکر دوسری جگہ پہنچایا جاسکے۔ بہار اور اڑیسہ اور اسی سلسلہ میں شمال مشرقی بنگال میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کوئلہ کے دوسرے علاقے سنٹرل انڈیا، حیدرآباد اور مدراس میں جو سب پاکستان سے باہر ہیں۔ پنجاب، بلوچستان اور آسام میں کوئلہ بہت کم ہے۔ لوہا، کچا منگینیز، کچا کروم، سونا، باکسائیٹ، تانے کا منگینیز اور ابرق جن علاقوں میں نکلتا ہے وہ سب پاکستان کی حدود کے باہر ہیں۔ پاکستان کی حدود میں جو کچھ مل سکتا ہے وہ پیشہ ولیم ہے جو ڈگبوی، بدرپور، گھوڑہوئیلا اور چھپہرہ کے علاقوں سے نکلتا ہے۔ یہ مقامات آسام اور شمال مغربی پنجاب میں واقع ہیں۔

ہندوستان کے ان معدنی خزانوں کا مختصر جائزہ لیجئے تو

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ خزانے ہندوستان کے اہل علاقوں میں جو ہندوؤں یا مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے ہیں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ اگر ہندوستان کو آبادی کے لحاظ سے عقائد کی بنا پر تقسیم کیا جائے تو ہندو آبادی کے حصہ کا ملک اور مسلمان آبادی کے حصہ کا ملک نمایاں طور پر مغلس ہوگا۔ ایک بند تجارت کے نظام میں بنگال کی پاکستانی ریاست صنعتی اعتبار سے مُروہ ہو جائے گی۔ آسام کی مسلمان ریاست کی اقتصادی حالت بھی اچھی نہ ہوگی۔ اس جہت میں کوئی نمایاں معدنی دولت سوائے اس کے نہیں ہے کہ یہاں سے پٹرولیم اور کھوڑا بہت کروم نکلتا ہے خواہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے یا نہ تقسیم کیا جائے۔ پنجاب اور مغرب کی طرف کی مسلم ریاستوں کی اقتصادیات میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوگی یہ اسی حالت میں رہیں گے جو اس وقت ان کی حالت ہے یعنی دیہاتی اور زرعی زندگی ہوئی اور اقتصادی اعتبار سے ہندوستان کے باجگزار ہوں گے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو حالات آج کل پیش ہیں ان میں ہندو اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو مرکزی حکومت کی طرف سے امداد مل رہی ہے اور بلوچستان کی تو تمام ذمہ داری ہی مرکزی حکومت پر ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی سکیم نہیں بنائی گئی جس سے ان انتظامی علاقوں اور پنجاب کی اقتصادی حالت نہ صرف اتنی شہر جائے کہ مرکزی حکومت کی مدد کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ زبردست مصارف بھی پورے ہو سکیں جن کی ایک آزاد خود مختار حکومت کو اپنی حفاظت اور دوسرے لوازمات کے پورے پورے انتظام کے لئے ضرورت ہوتی ہے اگر اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود بنانے اور کھلانے کے اصول کا ایک منطقی دلیل کی صورت میں پیش کر کے انہارے اور جانڈھر کے علاقوں کو پاکستان کی حدود سے نکال لیا جا تو صورت حالات اور بھی زیادہ نازک ہو جائے گی۔ دلیل کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان

۱۔ ہندوستان کی معدنی دولت اور اس ملک کا سیاسی مستقبل "مختصر چارلس مینجہرہ"

INDIA'S MINERAL WEALTH AND POLITICAL FUTURE

CHARLES M. BEHRE

”اپنی اقتصادی حالت کو خود ہی نبھال لے گا۔ لیکن اگر یہ صنایع پاکستان سے باہر نکال دیئے گئے تو کوئی اقتصادی حالت ہی نہ رہے گی جسے نبھالا جاسکے۔ کرس اور گودہ تو غیروں کو بلجائیگا اور مسلمانوں کے حصہ میں کھلیاں اور راول پنڈی۔ ملتان اور بلوچستان کے ریتلے میدان رہ جائیں گے۔ اس کے علاوہ میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ کوئی سکھ اس بات پر راضی ہو جائیگا کہ اتر سر پاکستان کی حدود میں رہے۔ اس کے بعد لاہور کہاں ہوگا؟

پاکستان میں یا ہندوستان میں؟

شمال مشرقی پاکستان کی مالی حالت کو سرسری نگاہ سے جانچا جائے تو اس سے بھی زیادہ یاکس کُن تصویر نظر آئے گی۔ یہاں بھی بردوان کے ضلع میں اور چوہیں پرگوس میں ہندو اکثریت ہے اور اگر ان دونوں علاقوں کو پاکستان میں سے الگ کر دیا جائے تو پاکستان میں آبادی کا تناسب تو ضرور بڑھ جائے گا۔ لیکن اقتصادی حیثیت بہت زیادہ اتر ہو جائے گی۔ اگر یہاں بھی ”اپنے سیاسی و معاشی حالات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کے اصول کو ایک منطقی دلیل کی صورت میں دیکھا جائے تو آسام کو جس کی دو تہائی آبادی ہندو ہے پاکستان سے الگ کرنا ہوگا اور مسلمانوں کو شہر کلکتہ اور اس کی بندرگاہ کی سہولتوں اور اس کی تجارت اور اس کے کاروبار سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

یہ اندیشہ درست ہے کہ ممکن ہے کہ ایک متحدہ (اکھنڈ) ہندوستان میں ہندو صنعت کاری کا غلبہ ہو لیکن جس کو یہ اندیشہ ہے وہ یہ بھی فرض کر لیتا ہے کہ موجودہ اقتصادی نظام اسی طرح رہے گا۔ اگر آئندہ زمانے میں ہندوستان میں قومی حکومت ہوئی اور ایک جماعت کی حکومت نہ ہوئی تو یہ بات لازم ہے کہ حکومت کا ہاتھ کسی نہ کسی شکل میں بے روک ٹوک سرمایہ داری کو کچل دے گا۔ اور اس صورت میں مسلمانوں کو دوسری اقلیتوں کو ہندو اکثریت کے اقتصادی غلبہ کا ڈر نہ رہے گا۔

اس اصول میں کہ ہر قوم کو اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو سدھارنے اور سلجھانے کا حق ہونا چاہیے کسی اس انتشار کی گنجائش نہیں ہے لیکن جب اس اصول کی بنیاد ”خراب“ سیاسیات اور اس سے بھی بدتر اقتصادیات پر ہو تو اس اصول کی یہ حیثیت نہیں رہتی ہے۔ یہ اصول صرف یہ کہہ دینے سے قابل تسلیم نہیں ہو جاتا کہ ایسے علاقے مسلمانوں کے وطن ہیں۔ جہاں مسلم اکثریت چون یا باسٹ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو ایک حد تک دھوکا دینے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینے کے غفل کو اگر وقت پر روک نہ دیا جائے تو یہ فعل تباہ کن اور المانک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ بہار کے مسلمان کا وطن بنگال ہے۔ اور تہذیب و تمدن اور نسل کے لحاظ سے اس کی قومیت وہی ہے جو چنگاؤں کے مسلمان کی قومیت ہے اور اس کی وہ قومیت نہیں ہے۔ جو بہار کے ہندو کی قومیت ہے اور یہ کہنا کہ لکھنؤ کے مسلمان کا وطن سندھ و بلوچستان شمال مغربی سرحدی صوبہ یا مغربی پنجاب ہے۔ اور یہ کہنا کہ تہذیب و تمدن اور نسل کے اعتبار سے اس کی وہی قومیت ہے جو ایک بلوچ یا سرحدی پٹان کی قومیت ہے۔ اور اس کی وہ قومیت نہیں ہے جو صوبہ جات متحدہ کے ایک ہٹا کی قومیت ہے یہ سب ایک ایسا دعویٰ ہے جو بہت لوگوں کی نظر میں ٹھیک نہیں ہوگا بلکہ مضحکہ خیز ہوگا۔

اس اصول کو تسلیم کرنے کی کوشش میں کہ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کا حق ہر قوم کو ہونا چاہئے ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے جس کی بنیاد سوویٹ یونین کی ایک تازہ ترین مثال پر رکھی جاتی ہے لیکن جس اصول کو روس نے پیش کیا ہے وہ ہندوستان پر صبح نہیں اترتا۔ روس میں مختلف فرقوں اور اقلیتوں کو ایسی رعایتیں دی گئی ہیں جس سوویٹ یونین کی بحیثیت مجموعی انصاف پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جموعی حیثیت سے اس حکومت کی متحدہ اور واحد حیثیت بدستور قائم ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ دوسری وفاقی (فیڈرل) حکومتوں کی طرح مرکز کو زیادہ اختیار مل گئے، ”ہندوستان میں کوئی انتظامی حلقہ ایسا نہیں ہے جس کی آبادی یکساں ہو اور اس میں مختلف عناصر موجود نہوں اور جسے اس خودارادیت کے اصول کے مطابق اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کا اختیار دیا جاسکے۔ اس کے علاوہ سوویٹ یونین کی جمہوریتوں کا جہان تک تعلق ہے انھیں اس قسم کے ”خودارادیت“ کے اصول کے مطابق اپنے معاملات کو خود سلجھانے کا حق دینا اس لیے قطعی طور پر غیر ضروری تھا کہ (۱) ان میں سے ہر ایک جمہوریت اشتراکی اقتصادی نظام رکھتی ہے اور جب تک اس جمہوریت کے اقتصادی نظام کی بالکل کاپیا مل نہ ہو جائے اس وقت تک وہ جمہوریت سوویٹ یونین سے باہر ہر سرمایہ داروں کے ملکوں میں زندہ نہیں رہ سکتی ہے نیز (۲) سوویٹ یونین کی اہم ترین جماعت یعنی کمیونسٹ پارٹی ان جمہوریتوں کی سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر نظر اور نگرانی رکھتی ہے اور کمیونسٹ پارٹی موجودہ سوویٹ یونین کے کسی حصہ کو اس سے ٹوٹ کر الگ نہیں ہونے دیگی۔ اس لیے بغیر اس صورت کے اور اس وقت تک جب تک کہ ہندوستان ایسے ہی ایک اقتصادی نظام کو قبول نہ کر لے اور اس ملک کی سیاسی زندگی ایک اچھی طرح سے منظم کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں میں نہ ہو ہمیں زیادہ ثقافت اور تہذیب و تمدن کے ٹھکانے میں خود مختاری کچھ ل (ٹانومی) کی طرف غور کرنا چاہیے بہ نسبت اس کے کہ ”خودارادیت“ یعنی اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کے حق کی طرف توجہ کریں۔

پاکستان کے معاملہ میں ایک اور دشواری دفاع کا مسئلہ اور سفارتی تعلقات کی تکنیک ہے۔ اگر پاکستانی ریاستوں کو حکمرانی کے پورے اختیارات حاصل ہوں

تو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو معاہدہ ہوگا وہ اس قسم کا ہوگا جیسا کہ دو آئندہ
 دو دھماکہ خیز حکومتوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ اُس قسم کے اقلیتی معاہدہ سے کُل
 ہی مختلف ہوگا جیسا کہ ایک سلطنت اور اس کی اقلیتوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کا
 معاہدہ اُس وقت تک تیار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس قسم کے معاہدہ کے تیار کرنے
 کے لیے ذہن اُس وقت تک آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلم لیگ صاف صاف الفاظ میں
 ہندوستان کی تقسیم کی تجویز کو اور اس تجویز کے سیاسی، فوجی اور اقتصادی پہلوؤں کو پیش
 نہ کر دے کیونکہ پوری طرح الگ ہو جانے کی صورت میں ان پہلوؤں کی وجہ سے ایک
 خاص قسم کی دشواریاں پیدا ہوں گی جو اس صورت میں پیدا نہیں ہونگی جبکہ پاکستان
 دائرین فیڈریشن اور فاق ہند کا ایک حصہ ہو۔ یہ تمام ہندوستانیوں کی زندگی اور صوت
 کا سوال ہے کہ ان کے ملکی دفاع کے انتظامات جدا جدا اور بہت سے لوگوں کے ہاتھ میں
 بٹے ہوئے ہوں اور اتنے پیچیدہ اور الجھے ہوئے نہ بن جائیں کہ وہ کارگر ثابت نہ ہوں
 نیز ہندوستانیوں کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ اتنا زیادہ روپیہ انتظامات پر صرف نہ ہو کہ انتظامات
 جاری نہ رہ سکیں۔ یہ ضروری ہے کہ بین الاقوامی دنیا کی نظروں میں ہندوستان کی حیثیت
 پوری طرح سے پکی اور استوار ہو۔ اس مقالے کے ابتدائی حصوں میں یہ بتا دیا گیا ہے
 کہ یہ مسائل بہت اہم اور نازک ہیں۔

پاکستان کے خلاف جو کچھ عرض کرنا تھا وہ ختم ہوا اب اس بحث کو ابراہام لنکن کے
 ان نصیحت آمیز الفاظ پر ختم کر دینا چاہیے جنہیں اکثر دہرایا جاتا ہے اور جو ابراہام لنکن نے
 اپنے ہم وطنوں سے اس وقت کہے تھے جبکہ امریکہ کی شمالی اور جنوبی ریاستوں
 میں جنگ ہو رہی تھی۔ ابراہام لنکن نے کہا تھا کہ

مادی اور جسمانی طور پر ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے ہم
 اپنے ملک کے حصوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں لیجا سکتے اور

نہ ان دو حصوں کے درمیان ایسی دیوار کھڑی کی جاسکتی ہے جسے عبور کرنا ممکن نہ ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ میاں جو ی میں آپس میں طلاق ہو جائے اور دونوں الیے اوجھل ہو جائیں کہ ایک دوسرے سے ہلک نہ پہنچ سکیں لیکن ہمارے ملک کے مختلف حصوں کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا ہمارے ملک کے دونوں حصے اس بات پر مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کے سامنے رہیں اور کسی نہ کسی طرح کا آپس کا تعلق قائم رہے خواہ وہ دشمنی کا تعلق ہو یا دوستی تو کیا اس تعلق کو الگ ہونے کے بعد پہلے کی نسبت زیادہ مفید یا تسلی بخش بنایا جاسکتا ہے؟ کیا غیروں میں معاہدے ہونا اس سے زیادہ آسان ہے کہ دوست مل کر قوانین بنائیں؟ کیا غیروں کے درمیان جو معاہدے ہوتے ہیں ان پر اس سے زیادہ اچھی طرح عمل ہوتا ہے جتنا کہ ان قوانین جنہیں دوست مل کر بناتے ہیں؟ فرض کرو تم میں جنگ چھڑ جائے تو تو یہ ممکن نہیں ہے کہ تم ہمیشہ ہی لڑتے رہو اور جب دونوں فریق خوب تھکا اٹھالیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہنچے اس وقت جنگ ختم ہو جائے تو وہی پرانے سوالات پھر تمہارے سامنے آجائیں گے کہ وہ کیا شرائط ہیں جن پر ایک دوسرے سے تعلقات قائم ہوں؟ یہ دعوے تو نہیں ہے کہ ایک اور درجہ ذیل اسکیم جو پیش کی جا رہی ہے بے عیب ہے یا مکمل ہے۔ لیکن اس میں میرے خیال میں یہ خوبی ضرور ہے کہ اس پر آسانی سے عمل درآمد ہو سکتا ہے اور آج کل ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے غیر معقول بھی نہیں ہے اب ہم اپنی اس اسکیم کو سرکاری سودہ قانون کو بنیاد قرار دیکر پیش کرتے ہیں۔

(ب) یونین آف انڈیا

۱۔ یہ یونین وفاقی (فیڈرل) اصول پر قائم ہوگی۔

۲۔ یہ یونین وفاق (فیڈریشن) میں شامل ہونے والی بہت سی چھوٹی خود مختار حکومتوں سے بنے گی۔ اور اس یونین کا ایک مرکزی مقام بھی ہوگا۔

۳۔ جہاں کہیں ضرورت پڑے وہاں ان حکومتوں کی سرحدوں کو دیاڑ معین کیا جاسکتا ہے۔ یعنی موجودہ برطانوی ہنگاموں کی سرحدیں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

۴۔ شمال مغرب اور شمال مشرق کے دوصوبوں کو خاص طور پر اس لئے سرحدیں تبدیل کر کے نئی شکل دی جائے گی کہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی کافی زیادہ اکثریت ہو جائے۔

۵۔ یہ حکومتیں خود مختار ہوں گی اور اندرونی معاملات میں ان کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

۶۔ بیرونی معاملات میں ان حکومتوں پر پابندی صرف انہی اختیارات کی وجہ سے عاید ہوگی جو مختلف حکومتوں نے آپس میں مل کر کے یونین کو منتقل کر دیے ہیں۔

(۱) اختیارات۔ مرکزی حکومت کی بھگائی اور اسکے اختیارات میں مندرجہ ذیل امور ہونگے۔

دفاع۔ ممالک خارجہ سے تعلقات۔ کرنسی۔ پندرگاہی محصول۔ نشر و اشاعت۔ ہوائی سروس۔ ریلوے۔ جہازی آمد و رفت اور جہازوں کا انتظام۔ تار اور ڈاک کا محکمہ۔

ایسے اختیارات بھی ضروروں کو حاصل ہوں گے جن کے متعلق تصریح نہ کی گئی

ہو

(۲) فیڈرل اسمبلی کی ترکیب - وفاقی حکومت کے ایوان (فیڈرل اسمبلی) کی ترکیب میں مختلف عناصر کا تناسب حسب ذیل ہوگا۔

مسلم _____ ۲۰ فیصدی

ہندو _____ ۲۰ فیصدی

اچھوت _____ ۱۰ فیصدی

باقی ماندہ آبادی جس میں ہندوستانی عیسائی

اینگلو انڈین سکھ - پارسی اور قبائل وغیرہ

شامل ہیں _____ ۱۰ فیصدی

مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اکثریت کی حکومت میں جہاں اکثریت ہمیشہ قائم رہے گی وہاں مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے تابع رہیں گے۔

مختلف عناصر کی نمائندگی کا جو تناسب تجویز کیا گیا ہے اس کی وجہ سے اکثریت کی حیثیت بدلتی رہے گی۔ اور اکثریت اس بات پر مجبور ہوگی کہ دوسری جماعتوں کے ساتھ سرگرمی سے ملکہ کام کرے۔ اس ترکیب کی وجہ سے مسلمان اور ہندو کو برابر کا موقع حاصل ہوگا کہ اپنی اکثریت بنالے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اچھوت اور دوسری جماعتیں ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ہی رہیں گے۔ ۱۹۳۵ء کے قانون پر عمل ہونے کے بعد تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ یہ عناصر بدلتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ اس تجویز میں اس بات کا بھی لحاظ ہے کہ جو اکثریت بھی ہوگی اس کا اقلیت سے اتنا کم فرق ہوگا کہ اسے فریق مخالف کی ہمدردی اور ان کی اخلاقی تائید کا دست نگر ہونا پڑے گا۔ ہمیشہ قائم رہنے والی اکثریت کا تو سوال ہی اٹھ گیا ہے اور اب یہ امکان بھی نہیں

رہا کہ اکثریت آئندہ اقلیت کو کچل دے گی ؟

اس تجویز سے مسلمانوں کو اچھی طرح مطمئن ہو جانا چاہئے کم از کم اسی وجہ سے کہ اس تجویز کے تحت مسلمانوں اور ہندوؤں کو برابر کی نمائندگی حاصل ہے۔ مسٹر جاج کو بھی خاص طور پر مطمئن ہونا چاہیئے۔ مسٹر جاج نے مسٹر گاندھی کے اس فقرے کے جواب میں کہ ”میں مذاق میں یہ نہیں کہہ رہا کہ قائد اعظم جاج میرے بھائی ہیں“ طنزیہ انداز میں منہیں کر کہا تھا کہ صرف اتنا فرق ہے کہ بھائی ”گاندھی“ کے قبضہ میں ہیں و وٹ ہیں اور میرے پاس ایک ہی وٹ ہے۔ ”ہمارا“ تجویز ہندوؤں کو اس لئے پسند ہونی چاہئے کہ اگرچہ اس میں ہندوؤں سے کسی قدر قربانی کرنے کی توقع کی گئی ہے۔ لیکن ان کے مفاد کو دراصل قربان نہیں کر دیا گیا ہے۔

(۳) دستور ساز جماعت اس مسئلے میں کہ دستور کون تیار کرے وہی فرقہ وارانہ دشواریاں ہیں جن کا خود دستور کے معاملے میں درپیش ہونا ضروری ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دستور ساز جماعت میں جو فرقہ وارانہ تناسب ہوگا اسی تناسب پر دستور کی نوعیت کا انحصار ہوگا۔ کانگریس کا پلان یہ تھا کہ دستور تیار کرنے کے معاملے کو ایسی نمائندہ دستور اسمبلی رکالٹیٹیو اینٹ اسمبلی پر چھوڑ دیا جائے جس کی بنیاد تمام باغیوں کے رائے دے سکنے کے حق پر ہو۔ اس نمائندہ دستور ساز اسمبلی کے ترکیب دینے کے معاملہ میں کانگریس نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ ان معاملات کو جن کا تعلق اقلیت کے حقوق سے ہے اکثریت اور اقلیت کے درمیان سمجھوتے سے طے کیا جائے گا۔ اور اگر سمجھوتہ نہ ہو سکا تو ان معاملات کو ثالث کے ذریعے طے کیا جائے گا۔ مسلم لیگ اس تجویز کے خلاف ہے۔ اور نہ مسلم لیگ ایک ایسی دستور ساز جماعت کے حق میں ہے جسے

صوبائی قانون ساز مجالس کے چھوٹے ایوان منتخب کریں۔ اور جس کا ذکر سرکاری مسودہ قانون میں تھا۔ لیکن ہماری رائے میں اس طرز کی دستور ساز جماعت کی تجویز کو کچھ ترمیموں کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔ تاکہ اس طرح اس میں لیگ کے بعض معقول اور واقعی مطالبات کو شامل کیا جاسکے۔

ان مختلف رایوں کو جن میں ایک دوسرے سے اتنا اختلاف ہے مندرجہ ذیل طریقہ سے کسی قدر ایک دوسرے کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔

ہم نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے نہشتیں تجویز کی ہیں۔ ان انہی نہشتوں کو چالیس دوسرے حلقے ہائے انتخاب سے اس طرح پر کیا جائے کہ ہر حلقہ انتخاب سے ایک ہندو اور ایک مسلم ممبر منتخب ہو۔ ان میں سے ہر ایک حلقہ کو پانچ سو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر حصہ میں ایسے بالغ ہندوؤں اور بالغ مسلمانوں کے الگ الگ رجسٹر تیار کئے جائیں جو خواندہ ہوں یا اپنا گھر رکھتے ہوں یا ٹیکس ادا کرتے ہوں۔ ہر ایک حصے میں ہندو آبادی اور مسلمان آبادی ایک ہندو اور ایک مسلمان نمائندہ منتخب کرے۔ اس طرح ہر ایک حلقہ انتخاب میں جداگانہ طریق انتخاب کے ذریعہ پانچ سو ہندو اور پانچ سو مسلمان منتخب ہوں گے۔ یہ ایک ہزار آدمی مخلوط طریق انتخاب کے ذریعہ ایک مسلم اور ایک ہندو ممبر منتخب کریں۔ اچھوت طبقے اور دوسری جماعتوں کے متعلق بھی ایسا ہی طریق عمل اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمائندے مل کر ہندو اور مسلمان ممبروں کو چنیں گے۔ یہ حد بندی اور علیحدگی دور ہو جائے گی۔ اور آپس کی بدگمانی اور باہمی شبہ کا شائبہ نہ رہے گا۔ اس طرح نیچے کے ایسے ایوانوں میں سے جو اس طرح بنے ہوں۔ دسٹس فیصدی ارکان لے کر دستور ساز جماعت بنائی جاسکتی ہے۔

دہم، مجلس عاملہ

(الف) کابینہ میں بھی ممبروں کی تعداد کا فرقہ دارانہ تناسب دہی ہوگا جو اسمبلی میں ہوگا۔

(ب) مجلس عاملہ مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوگی۔

(ج) وزیر اعظم باری باری ایک دفعہ ہندو اور ایک دفعہ مسلمان ہوگا

(د) نائب وزیر اعظم اس صورت میں ہندو ہوگا جب وزیر اعظم مسلمان ہو اور جب وزیر اعظم ہندو ہو اس وقت نائب وزیر اعظم مسلمان ہوگا۔

(س) اگر کمانڈر انچیف ایک غیر مسلم ہو تو وزیر دفاع مسلمان ہوگا اور اس کے برعکس اگر وزیر دفاع غیر مسلم ہو تو کمانڈر انچیف ایک مسلم ہوگا۔

(س) مجموعی ذمہ داری ایک سہی بات ہوگی۔ (اصول سے قطع نظر یہ کسی ایسے فیصلے کے خلاف ایک محفوظ ہوگا جس سے کسی خاص فرقے یا جماعت پر اثر پڑے۔ اور اس فیصلے کو اس جماعت یا فرقے کی رائے دریافت کے بغیر اختیار کر لیا گیا ہو کیونکہ اس خاص فرقے کے وزیروں کے استعفیٰ داخل کر دینے سے کابینہ ٹوٹ جائے گی،

(ش) سول سروس سول سروس میں تقرر کے سلسلے میں جہاں تک ممکن ہوگا۔ اور جہاں تک کہ کام کو اچھی طرح سے انجام دے سکنے کا سوال ہوگا۔ اسی فرقہ دارانہ تناسب کا خیال رکھا جائے گا۔ ملازمت میں ترقی کا انحصار عام طور پر اچھی کارکردگی اور مرتبہ اور مدت ملازمت کے تقدم پر ہوگا۔

(ص) عوام کے ادارے۔۔۔ لوکل سلفٹ گورنمنٹ کے تمام اداروں میں۔ کارپوریشن میں میونسپل کمیٹیوں میں اور اسی قسم کے مختلف بورڈوں اور کمیشنوں میں اسی تناسب کو برقرار رکھا جائے گا۔

(ض) فوجی ملازمتیں۔ ہندوستان کی معرکہ آرا فوجوں میں یہ تناسب ہوگا

مسلمان _____ ۵۰ فیصدی

غیر مسلم _____ ۵۰ فیصدی

(ط) تحفظات کی دفعات

اس سلسلہ میں کانگریس کے اس اعلان کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے جو ۱۹۳۳ء میں بنیادی حقوق کے متعلق اُس نے جاری کیا تھا اور پھر ۱۹۳۸ء میں اقلیتوں کے حقوق کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کے اجلاس میں کانگریس نے ان الفاظ میں اس کی توثیق کر دی: "اس سلسلہ میں کانگریس ہمیشہ دو بنیادی اصولوں پر قائم رہی ہے۔ اور اس نے ہر قدم ان ہی اصولوں کی روشنی میں اٹھایا ہے۔ (اور وہ اصول کیا ہیں)

(۱) ہندوستان میں جس قسم کا آئین بھی اختیار کیا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کا پورا پورا انتظام ہونا چاہیے۔

(۲) اقلیتوں کو خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کیلئے تحفظات کی ضرورت ہوگی۔ اکثریت کو اس بارہ میں اپنا فیصلہ نہیں دینا چاہیے لہذا اس مسئلہ کا فیصلہ اقلیتوں کی منظوری پر منحصر ہونا چاہیے نہ کہ اکثریت کی رائے پر۔

۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ نے اپنے لئے ایک فارمولا تیار کیا جو دوسرے الفاظ میں "مسٹر جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہے۔ اور ۱۹۳۸ء میں کانگریس کو اپنے مطالبات کی ایک فہرست پیش کی جو مسٹر جناح کے گیارہ نکات کے نام سے مشہور ہے۔ ان گیارہ نکات میں واضح کر دیا گیا کہ کون کون سے تحفظات چاہئیں۔ یہ تحفظات دو بڑی شقوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ (۱) مذہبی،

سماجی اور ثقافتی اور (ب) سیاسی اور انتظامی۔

(ا) ان کا تعلق ذیل کے امور سے ہے۔

بندے ماترم کا گیت

گائے کا مسئلہ

اذان

زبان کا مسئلہ

قومی جھنڈا

بندے ماترم کے قومی گیت میں سے قابل اعتراض حصے حذف کئے جا چکے ہیں۔ اقبال کا ترانہ بھی پڑھا جا رہا ہے۔ اس وقت تو دونوں گیتوں کو سرکاری طور پر یکجا کر دینا چاہیے۔ اسی طرح کانگریس کے جھنڈے پر بھی مسلمانوں کے امتیازی نشان کو جگہ ملنی چاہئے۔ گائے کی قربانی کو برداشت کر لینا چاہئے اور فریقین کے جذبات کے احترام کی خاطر قربانی کی رسم بغیر کسی نمائش کے عمل میں آنی چاہئے۔ اذان کے مسئلہ میں کسی قسم کی دقت نہیں پیش آئی چاہئے۔ جناح کی قبر میں مسجد کے سامنے باجہ کا سوال شامل نہیں ہے۔ لیکن پریور پورٹ میں اس شکایت کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ تاہم مسجد کے سامنے باجہ بند کر دینے پر ہندوؤں کے جلوس کو پُر امن طریقہ گزار جانے کی اجازت ہونی چاہئے۔

زبان کا مسئلہ بے شک بہت پیڑھا ہے اور اسی طرح رسم الخط کا بھی۔

لیکن بہتر یہ کہ جھگڑے کو مٹانے کے لئے مرکز میں انگریزی زبان اور رومن رسم الخط کو اختیار کر لیا جائے۔ صوبوں میں مقامی زبانوں کے استعمال کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

(ب) ان کا تعلق ذیل کے امور سے ہوگا۔

(۱) علاقوں کی از سر نو تقسیم جو کسی صوبہ میں مسلم اکثریت پر اثر انداز ہو رہی

ہو +

(۲) مسلمانوں کے شرعی قانون اور ان کی ثقافت کا از روئے قانون

تھفظ +

(۳) مقامی اداروں اور حکومت کے ماتحت ملازمتوں میں فرمتہ دار

تناسب کا از روئے قانون تعین، اگر پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیا گیا تو پہلا

سوال پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اور دوسرے کو تسلیم کر لینا چاہیے +

بہت ممکن ہے کہ اس اشارہ میں مزید شکایات پیدا ہو چکی ہوں۔ لیگ

کو چاہیے کہ ان شکایات کی ایک تازہ ترین فہرست مرتب کر دے۔ اور متنازع

امور کو ایسی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب دے کہ ان پر معقول طور پر تبادلہ خیال

کیا جاسکے اور ان پر نصفہ ممکن ہو سکے۔

(۹) تحفظات کے موثر بنیکی ضمانت :- یہ اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے آئین میں جن تحفظات کا ذکر

ہے ان کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے اور اس سلسلہ میں بڑی تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے پوچھا جاتا ہے

کہ اس بات کی ضمانت کہاں ہو اور اس چیز کا کون ضامن ہو کہ ان تحفظات کو پورا کیا جائے گا ؟

یورپ کے معاہدات اقلیت "بین الاقوامی واجبات کی حیثیت رکھتے تھے اور مجلس اقوام

(League of Nations) انکی ضامن تھی کنیڈا کی ڈونن میں جو تحفظات فرانس کی اقلیت کو دیے گئے

تھے قانون ویسٹ منسٹر نے ان کی ضمانت کی تھی جہاں تک ہمارا تعلق ہے سو وہ قانون ڈرا

ڈ کلریشن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے تحفظات کی ضمانت برطانیہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا

ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان اور دولت متحدہ (UNITED KINGDOM) کے

درمیان معاہدے میں ملک معظم کی حکومت کے وعدوں کے مطابق نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے

تحفظ کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

ممکن ہے ہندوستان اگر وہ یونین آف انڈیا کی خود مختار حیثیت کو عزیز رکھتا ہے اور ایسے مکمل درجہ مستعمرات (DOMINION STATUS) میں یقین رکھتا ہے جو تحفظات کے سلسلہ میں کسی بیرونی طاقت کی خواہ وہ دولت متحدہ ہو یا مجلس اقوام ہو یا کوئی اور طاقت ہو جگہ لے سکے تو وہ اس درجہ کو قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ اگر صورت حالات یہ ہو تو ہم ملک کے قانون پر اعتماد رکھیں گے اور اپنی شکایات کو رفع کرنے کے لئے عدالت ارکان اتحادیہ کورٹ آف دی یونٹس یا عدالت عالیہ اتحادیہ اسپریم کورٹ آف دی یونین یا آخر میں بین الاقوامی عدالت میں اپیل کریں گے۔

(۱۰) ثقافتی تحفظات: ”گیارہ نکات“ میں جن ثقافتی تحفظات کا ذکر ہے ان سے زیادہ تحفظات کی اس سلسلہ میں ضرورت ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نسلی اختلافات اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ ثقافتی اختلافات۔ دونوں فرقوں کے نسلی عنصر میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ ثقافتی اختلافات بھی بہت نمایاں نہیں۔ ہندوؤں کے ساتھ صدیوں تک رہنے کی وجہ سے عام مسلمان کا درہ خیر کے دوسری طرف کے ملکوں سے تعلق ٹوٹ چکا ہے۔ اب ہندوستان ہی اس کی ثقافتی اور معاشرتی دنیا بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس کی زندگی کے تلنے بانے میں اختلافات اور یکسانیتوں کے مل جلنا رہا پائے جاتے ہیں عملی طور پر مسلمان کو جس چیز کی فکر ہے وہ سیاسی اور انتظامی تحفظات ہیں ثقافتی خود اختیاری کا کوئی ایسا زوردار مطالبہ سننے میں نہیں آتا جیسا کہ ایسٹنیا کے معاہدہ اقلیت کے ذریعہ یا سویت روس میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جو بھی ثقافتی اختلافات پائے جاتے ہیں ان کا تحفظ ضروری ہے۔ ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہوں گے:-

ایمان و اعتقاد کی آزادی۔
مذہبی ادارے
تعلیمی ادارے
خیراتی ادارے

ایسٹونیا کے ثقافتی خود اختیاری کے قانون کی طرز پر ارکان اتحادیہ ہند (یونین آف انڈیا) میں اقلیتوں کے مذہبی- معاشرتی اور تعلیمی حقوق کی نگہداشت اور اداروں کے تحفظ اور نظم و نسق کے لئے ثقافتی کونسلیں قائم کرنا مفید ہوگا۔ (۱۱) سیاسی تحفظات :- اگر کوئی فرقہ کسی مسودہ قانون کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کے حقوق کے لئے نقصان دہ ہے تو اس وقت تک اس پر غور و خوض نہ کیا جائے جب تک اس فرقہ کے ممبران کی تین چوتھائی تعداد اس کے حق میں نہ ہو (مسٹر جناح کے چودہ نکات کا دوسرا نکتہ)

(۱۲) وہ تنجا ویز جن کا اثر سکھ فرقہ پر ہو۔ ان کی تحریک صرف پنجاب اسمبلی میں کی جائے اور وہ پیراگراف (۱۱) کے تحفظ کی پابند ہوں۔
(۱۳) جن تنجا ویز کا اثر پارسی فرقہ پر ہو ان کی تحریک صرف بمبئی اسمبلی میں کی جائے اور وہ پیراگراف (۱۱) کے تحفظ کی پابند ہوں۔

ارکان اتحادیہ ہند

جہاں تک وفاقی ریاستوں کی قانون ساز مجلسوں ایگزیکوٹو اور پبلک سروسوں میں نمائندگی کا تعلق ہے۔ مندرجہ ذیل باتیں قابل توجہ ہیں :-
(۱) اقلیتیں جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھ سکتی ہیں لیکن مرکز میں وہ مجلس قانون ساز کے تحت جو طریقہ نمائندگی تجویز کیا گیا اس پر عمل کریں۔
(۲) اقلیتیں اپنے نمائندوں کی موجودہ تعداد کو برقرار رکھیں لیکن بجٹل میں یورپیوں کی تعداد کو کافی کم کیا جائے۔

(۳) ارکان اتحادیہ کی سرحدوں میں رد و بدل کیا جائے لیکن اس طریقہ پر نہیں کہ اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے۔

(د) جہاں تک ممکن ہو گا کارکردگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے قانون ساز مجلسوں میں جو تناسب ہو گا وہی یونین آف انڈیا کی کابینہ اور پبلک سروسوں میں برقرار رکھا جائے گا۔

(س) یونین آف انڈیا کے تحت پیرا گراف ۶ دفعات (۴)، (۵)، (۶)، (۷)، (۸)، (۹)، (۱۰)، (۱۱)، اور (۱۲) میں جن امور پر بحث کی گئی ہے ان کا اطلاق یونین آف انڈیا پر موقع اور مناسبت سے ہو گا۔ خاص طور پر اقلیتوں کے تحفظات کے متعلق۔

کانگریس کی مجوزہ واحد حکومت ہند

اس سے ناقابل حل مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اس پر بحث کرنا بیکار ہے۔ باری باری مطلق اکثریت حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ:۔ برابر کے حصے سے زیادہ کا نہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ کسی کو دیا جاسکتا ہے مرکز میں برابر کا تناسب اس طرح برقرار رکھا جائیگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باری باری ۵۱ فیصدی کی مطلق اکثریت حاصل ہوگی۔ اس سے فوری فائدہ حاصل ہوں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہو گا کہ ووٹ حاصل کرنے کی مہین ختم ہو جائیں گی جس کا نتیجہ ہو گا کہ ہمارے سیاسی ماہروں کی موت اور صلاحیت بجائے ووٹ حاصل کرنے کے مخالفانہ سرگرمیوں میں صرف ہونے لگے۔ تعمیری کاموں میں صرف ہوگی۔ تعمیری قوم کا جو عظیم الشان کام درپیش ہے اس کے لئے بھی یہ چیز نہایت مفید ثابت ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ ہماری سیاسی دنیا میں انسانوں کے درمیان جو مستقل چیلنج پائی جاتی ہے۔ وہ دور ہو جائے گی ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے فضا زیادہ سے زیادہ سازگار ہوتی جائے گی اور مشترکہ فائدہ کے لئے متحدہ کارروائیاں عمل میں آئیں گی۔ تیسرا فائدہ یہ ہو گا کہ یہ علم ہونے کی وجہ سے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد دوسری جماعت برسرِ اقتدار آجائے گی

اور وہ اپنا بدلہ نکال سکتی ہے۔ کسی بھی پارٹی کو نامناسب تدابیر اختیار کر کے کامیاب نہ مل سکے گا۔ اس سے ایک خرابی ضرور ہوگی کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں کی انفرادی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس ۴۰ : ۴۰ فیصدی کے منصوبے کے تحت ان اقلیتوں کو مختلف جماعتوں کے درمیان قوت کے توازن کو برقرار رکھنے کی قابل رشک اور اہم حیثیت حاصل ہوگی۔ کوئی انسانی منصوبہ مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر یہ منصوبہ بڑے بڑے فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں خیالات کا اتحاد پیدا کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ تو اس منصوبے کے حق میں سب سے بڑی بات یہی ہے۔ اس سے ایک ایسی عظیم تبدیلی واقع ہوگی جو ہماری ہمت کو نئی قوت بخشنے کے لیے ساری سیاسی جدوجہد کو ایک نیا رنگ دے گی۔ اس کامیاب اور خوشگوار قضائے اور عظیم ذمہ داری کے احساس کے تحت یہ ناممکن ہے کہ چھوٹی اقلیتوں کے ساتھ معمولی سے معمولی بے انصافی کرنے کا کوئی خیال جگہ پائے۔ ایک بڑے کارنامہ سے دوسرے عظیم ترکارنامے انجام دینے کے لیے ہمت بڑھتی ہے۔

ویلول پلان

ابھی موجودہ کتاب زیر طبع تھی کہ ہذا یکشنبہ والٹر نے اپنے ساتھ دہلی پر ہندوستان میں عبوری دور کے لئے حکومت کی ایک تجویز لے لی تھی۔ یہ تجویز ویلول پلان کے نام سے مشہور ہے ویلول پلان میں گزاردہ صوبوں میں جو سیاسی تھیلوں کے کچھانے کے لئے ایک عارضی انتظام کی تجویز کے علاوہ یہ بھی درج ہے کہ سیاسی مسئلوں کے حل کرنے کے لئے کیا علی طریقہ اختیار کیا جائے۔ ملک معظم کی حکومت کی طرف سے جو قراضہ بعض شائع ہوا ہے اور ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق وزیر ہند مسٹر ایمری نے جو تقریر کی ہے ان دونوں کا مطالعہ بھی اس پلان کے ساتھ ضروری ہے۔ ہندوستان کے مستقبل کے متعلق قراضہ بعض کے مضمون کی اور دارالعوام میں وزیر ہند کی تقریر کے مطلب کو ہذا یکشنبہ والٹر نے اپنے ایک تار میں مختصر درج کر دیا ہے جو ۱۶ جون ۱۹۳۵ء کو مسٹر گاندھی کے نام روانہ کیا تھا۔ وہ تار درج ذیل ہے۔

”تاریخ ۱۹۳۲ء کی سپیکش اب بھی مکمل شکل میں حاضر ہے۔ یہ پیش کش دو بڑے اصولوں پر مبنی ہے۔ اول یہ کہ اس محل میں ہندوستان کی آزادی پر کوئی بندش نہیں ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو کیا شکل دیتا ہے۔ خواہ وہ دولت مشترکہ کا رکن بن کر ہے یا دولت مشترکہ سے باہر رہے اسے اختیار ہے۔ دوم یہ کہ یہ صورت اس دستور کے ذریعہ ہی پیدا ہو سکتی ہے جس دستور کو تمام ہندوستانیوں نے ملکر بنایا ہے جس پر آبادی کے بڑے بڑے حصے متفق اور رضامند ہوں۔“

ویلول پلان میں جو صورت تجویز کی گئی ہے اس کو مختصر درج ذیل کیا جاتا ہے
 (۱) مرکز میں پوری طرح ہندوستانیوں کا عمل و دخل ہوگا۔ یہاں تک

کے معاملات خارجہ کا قلمدان وزارت بھی ہندوستانی وزیر کے پاس ہوگا اور مرکز میں اونچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی برابر تعداد ہوگی اور ایک نشست بیچ ذات کے آدمیوں کے لئے۔ ایک نشست سکھوں کے لئے اور ایک نشست کسی اور اقلیت کے آدمی کے لئے ہوگی +

(۲) صوبائی کابینہ میں ہندو اور مسلمان متحد ہو کر حکومتیں بنائیں گے +

(۳) ایسے دوسرے نکات کا بھی ذکر ہے جن کا ہندوستان کی آئینہ

حیثیت پر اہم اثر پڑتا ہے۔

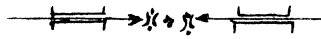
(الف) ہندوستان میں انگلستان کے ایک ہائی کمشنر کا تقرر۔

(ب) مختلف غیر مالک میں ہندوستان کے متعدد نمائندوں کا تقرر۔

مجھے یہ دیکھ کر خاص طور پر خوشی ہوئی کہ عملی حیثیت سے یہ ساری اسکیم میں نے اس کتاب کے مختلف حصوں میں اس وقت تجویز کی صورت میں پیش کر دی تھی جب کہ یہ کتاب گزشتہ دسمبر میں پہلی دفعہ شائع ہوئی تھی اگر عارضی انتظام کی حیثیت سے یہ اسکیم کامیاب ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس سے ایک نہایت مشکل مسئلے کا مستقل حل کیوں نہ ملے گا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے جزئیات اور تفصیلات پر غور کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن ایک ایسی اگر بیکھو کونسل جسے اس ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہو یقینی طور پر ایک عارضی انتظام کے اصول پر عمل کر کے ہندوستان کے مستقبل کیلئے ایک اطمینان بخش دستور بنا سکتی ہے۔ یہی بات کہ ان مختلف جماعتوں کے نمائندے جو ابھی تک ایک دوسرے کی مخالف تھیں مگر ایک کابینہ کی صورت میں بیٹھیں گے اور کاروبار حکومت کو چلائیں گے نہایت درجہ اہم اور اطمینان بخش ہے اور اسکی وجہ سے آپس کی بدگمانیاں رفع ہونگی اور عقولیت اور اعتماد کا احساس پیدا ہو جائیگا جس سے یہ امید کہ ملک اور تمام دنیا کے فائدے کے لئے ایک متفقہ دستور تیار ہو سکے گا۔

دسواں باب

ہندوستانی ریاستیں



ریاستوں کے پریشان کن سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اگر ہمارا
تبدیل فرمہ دارانہ مسئلہ کے حل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے تو ریاستوں کا مسئلہ
بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قانون
۱۹۳۵ء کے وفاقی کو ریاستوں نے قریب قریب مسترد کر دیا تھا۔ اب سرکاری
مسودہ اعلان میں یونین آف انڈیا راجا و ریہندوستان کے قیام کے لئے
ریاستوں کی شرکت لازمی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ "آفت را اعلیٰ" کے ساتھ
اپنے موجودہ یا کسی قدر تبدیل شدہ رشتہ کو برقرار رکھ کر اپنے قدیم حقوق کو محفوظ
رکھنا چاہیں۔ اور بلاشبہ بہت سے حقوق ہیں بھی گراں پایہ۔ لیکن یہ یقینی امر ہے
کہ خواہ ریاستیں یونین میں داخل ہونا پسند کریں یا نہ پسند کریں۔
انکی نئی جمہوریت کی روح ریاستوں میں بھی جلد اور لگاتار مراہت کوئی رہے گی۔ ممکن
ہے کہ اسی نقطہ نظر سے وہ یہ پسند کریں کہ یونین سے براہ راست تعلق قائم کیا
جائے تاکہ ان کی حیثیت میں کم تغیر واقع ہوا اور اس طرح وہ زیادہ آمادگی کے

کے ساتھ نئی روح کو اپنانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ شریک ہوں تو انہیں
(سرمعدوں کے خفیہ سے تغیر و تبدل کے ساتھ) آپس میں ملا کر ان کے حسب
ذیل بڑے بڑے گروہ بنائے جاسکتے ہیں:-

(۱) کشمیر اور پنجاب کی ریاستیں۔

(۲) گامٹھا دار اور راجپوتانہ کی ریاستیں

(۳) وسط ہند کی اور مشرقی ریاستیں

(۴) بیسور۔ ٹراونکور اور کوچین

(۵) حیدرآباد

یہ ماننا پڑے گا کہ اگر ریاستیں وفاق سے علیحدہ رہیں تو ان کے علاقوں کی

حربی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان کے دفاع کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ اس نہایت اہم
بات کو ملحوظ رکھ کر ریاستوں کو اس پر آمادہ کرنا چاہئے کہ وہ وفاق ہند
میں داخل ہو جائیں۔ ان کی علیحدگی سے دفاعی دیوار میں رخنے پڑ جائیں گے۔
وہ ریاستیں جو وفاق ہند میں شامل ہوں یونین کی دوسری دھڑوں

کی طرح خود مختار اور آزاد ہونی چاہئیں۔ لیکن یکسانیت اور مساوات و قار
کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ ان ریاستوں میں بھی جہاں تک ہوسکے
ویسی ہی نمائندہ حکومتیں ہوں جیسی کہ وفاق کے باقی ارکان میں۔ عام طور
پر ان ریاستوں کے فرمانرواؤں کے اقتدار پر کسی قسم کا اثر نہ پڑنا چاہئے
بجز ایسے مسائل کے جیسے کہ صرف خاص اور ان اختیارات کے جو دفاعی سہلی
یا یونین حکومت کو منتقل کر دیے جائیں۔ یہ اقتدار علیٰ حالہ قائم رہنا چاہئے۔

گیارہواں باب

فوری اعلانات ضروری ہیں

انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات کو نئی بنیاد پر قائم کرنے کی غرض سے اگر دستورات کا فوری اعلان کر کے ایک عارضی حکومت قائم کر دی گئی اور مجلس آئین ساز کے لئے ایسے انتظامات کر دیئے گئے کہ وہ سال بھر کے اندر ہی اپنا کام ختم کر لے تو یہ صورت قطعی ناقابل عمل ہوگی۔ سرپرست ہندوستان میں کسی ایک جماعت کو بھی اس حد تک عام اعتماد حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک عارضی حکومت کے فرائض سنبھال سکے اور اگر اسکا کوئی امکان ہے بھی تو بہت زیادہ نہیں ہے۔ کمکوئی مجلس آئین ساز جو کسی طرح بھی اس کی تشکیل عمل میں آئے سال بھر کے اندر کوئی مکمل آئین وضع کر سکے گی۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے نئے آئین کے مرتب کرنے کا کام عارضی حکومت کے قیام سے پہلے ہونا چاہئے۔ کیونکہ کسی اور صورت سے ایسی عارضی حکومت وجود میں آ ہی نہیں سکتی جسے عام اعتماد حاصل ہو سکتا ہے۔ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان عہد نامہ کا خاکہ بھی اُس وقت تک نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ یہ پتہ نہ چلے کہ کیا

آئین کیا شکل اختیار کر رہا ہے یا یہ کہ سیاسی طاقتیں کیا رویہ اختیار کر رہی ہیں اور سیاسی مرکز کہاں ہو گا۔

ہندوستان کے نئے آئین میں اختیارات جس پیمانہ پر منتقل ہوں گے اس پیمانہ پر ان کی منتقلی خود آئین سے قطع نظر ایک یا زائد ضمنی سمجھوتوں کے بغیر عمل میں نہیں آ سکتی اس کی قریب ترین مثال آئرش فری اسٹیٹ (ایگریمنٹ) ایکٹ ۱۹۲۲ء کے تحت مرتب کئے ہوئے مختلف آرڈیننس کوئسل میں ملتی ہے لیکن ان میں جو بحث کی گئی ہے وہ انتظامی شمیری سے متعلق مسائل سے ہے اصولی مسائل سے نہیں اصولی مسائل سے صرف نئی ہندوستانی حکومت ہی بحث کر سکے گی۔

بہر حال جس پہلو سے بھی دیکھئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان ایک عام اعلان کر دے (وہ پہلے بھی اکثر اعلانات کرتا رہا ہے مگر بظاہر انہیں باوجود نہیں کیا گیا) جو کچھ اس شکل میں ہو۔

”ہم خود ہندوستان کے لئے کوئی نیا آئین وضع کرنا یا کوئی آئین اپنی طرف سے اس پر مسلط کرنا نہیں چاہتے۔ ہندوستان کے نئے آئین کے وضع کرنے کی ذمہ داری اب خود ہندوستانیوں کے سر ہے نہ کہ کسی پر۔ ہم ہندوستان میں اپنے اختیارات اس نئی حکومت کو جو اس نئے آئین سے وجود میں آئے حسب ذیل شرائط کے ساتھ منتقل کرنے پر تیار ہیں۔ (۱) ہم کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیے کہ وہ آئین قابل عمل ہے یعنی یہ کہ اسے ان لوگوں کی جنہیں اس آئین کے تحت زندگی بسر کرنا ہے عام منظوری حاصل ہے۔

تختہ
(۲) ہم کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیے کہ آئین کے تحت اقلیتوں کا معقول طریقہ پر کیا گیا ہے لیکن یہاں بھی اگر آئین ان سب کے لئے جنہیں اقلیتیں بھی شامل ہیں

عام طور پر قابل قبول ہے جنہیں اس کے تحت زندگی بسر کرنا ہے تو یہ سوال پیدا ہی ہوگا
 بہر صورت ہم یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اقلیتوں کو اپنا تحفظ خود اس آئین ہی کے تحت
 تلاش کرنا ہوگا کیونکہ ہم کسی متوازی عہد نامہ کے ذریعہ ان کے لئے اس تحفظ کی ضما
 کرنا نہیں چاہتے ہم اقلیت کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کرنا چاہتے اس لئے کہ
 ہندوستان میں یہ اصطلاح خاصی معروض ہے لیکن ہم اسے گوارا نہیں کریں گے کہ
 ہر عہدول الحال اگر وہ اپنے کو اقلیت بنا کر پیش کرے تو اپنے مفادات کے تحفظ کا حق
 کر کے دستوری ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔

(۳) ہمیں اس کا اطمینان ہونا چاہیئے کہ دستور میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے
 ان ضمانتوں میں جو انگریزی حکومت نے ہندوستانی ریاستوں کو دی ہیں کمی ہوتی
 ہو، نیز یہ کہ جن شرائط پر ہندوستانی ریاستوں کو نئے دستور میں شامل ہونے کی
 دعوت دی جائے وہ منصفانہ اور معقول ہوں اور جس کے شائبہ سے خالی ہوں۔

(۴) ہم کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیئے کہ تاج کے جو ملازمین ہندوستان میں ہیں
 اور ان نئے دستوری انتظامات کے تحت خدمات انجام دینے پر رضامند نہ ہوں ان کے
 حقوق کا کافی حد تک تحفظ کیا جائیگا اور ان کی باضابطہ نشین اور دوسرے معاوضے میں
 یقینی طور پر یس گے ہمیں اس بات کا بھی اطمینان ہونا چاہیئے کہ جو دوسرے قسم کے حقوق
 خواہ تاج کی خدمات کے صلہ میں یا کسی اور بنا پر اور افراد کو پہلے حاصل تھے وہ انھیں
 اب بھی حاصل ہیں گے اور عدالتوں یا دوسرے غیر جانبدار ریونی کے تحفیض کیے ہوئے
 پورے پورے معاوضے ادا کیے بغیر وہ ان حقوق سے محروم نہ کیے جائیں گے۔

اگر یہ شرطیں پوری ہو جائیں تو نئے دستور کے نفاذ کے بعد ایک معنیہ مدت
 کے اندر ایک تاریخ مقرر کر دی جائے گی کہ اس تاریخ سے ہر قسم کی جملہ ذمہ داریاں
 نئی حکومت کو منتقل ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے کم اہمیت والے امور ہوں
 جنہیں کسی نہ کسی قسم کے متوازی سمجھوتہ کے ذریعہ طے کرنا پڑے جیسا کہ پچھلے فقرہ میں بتایا

جا چکا ہے۔ لہذا اس امکان کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہو گا تاکہ بعد میں بدیتی کا الزام عائد نہ ہو لیکن ان شرائط کے ساتھ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ ذمہ داریوں کی منتقلی مکمل اور قطعی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے کہ آئین سے ہندوستان آزاد ہو جاتا ہے یا جیسا کہ برطانیہ دولت عامہ کے دوسرے ارکان کا حال ہے۔ تاج کے ساتھ اسکا رشتہ اطاعت بدستور قائم رہتا ہے منتقلی کا عمل در آمد مختلف ہو گا لیکن یہ سوال بڑی حد تک نظام کار سے متعلق ہے۔

آخر میں جب ان امور کی تکمیل کی تاریخیں مقرر ہو چکیں تو انگلستان ہندوستان سے اسکا اظہار کر سکتا ہے کہ وہ تی ہندوستانی حکومت سے اگر وہ چاہے ایک تجارتی معاہدہ اور ایک امور دفارے سے متعلق معاہدہ پر تبادلہ خیال کرنا پسند کرے گا یہ سوال کہ اگر نئی ہندوستانی حکومت جواب میں یہ کہے کہ اسے اس طرح کی بات چیت کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے تو اس صورت میں انگلستان کیا کارروائی کرے آئندہ غور کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے مذکورہ بالا تجاویز میں جس پالیسی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ غیر تعمیری اور بے نتیجہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بظاہر ایسا ہی معلوم ہو لیکن ذرا سے غور و فکر سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا۔ کوئی بھی یہ نہیں خیال کرتا کہ اتنی پشتوں کے تعلق سے عہد انگلستان ایک جنش قلم سے یا کسی قسم کے اعلان کے ذریعہ اپنے آپ کو ہندوستان کے معاملات کے پوری طرح بے تعلق کر سکتا ہے اور نہ ہی خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے زیادہ صائب الراء طبقے اس قدر اچانک اور مکمل طور پر قطع تعلق پسند کرینگے لیکن بظاہر دو باتیں ایسی ہیں جن کا پورا ہونا دوسری تمام باتوں سے زیادہ ضروری ہے، ایک تو یہ کہ ہندوستان کے کسی طبقہ کو اس کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ یہ کہہ سکے کہ

حکومت برطانیہ نیک نیت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ ہم ہندوستانیوں کو اس پر مجبور کیا جائے کہ ہم خود ہی اپنے مسائل کا سامنا کریں اور ان کے حل کرنے کی ذمہ داری لیں۔ یہ دونوں باتیں ایک محاذ سے ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ کیونکہ اگر ہندوستان کو اس پر مجبور کیا جائے گا کہ اپنے مسائل کے تصفیہ کرنے کی ساری ذمہ داری خود ہی اپنے سرے توپیر کوئی شخص یہ نہ کہہ نہ سکے گا کہ انگلستان ہی انھیں ان مسائل کے تصفیہ کرنے سے روکتا ہے ان دو معاہدوں یا سمجھوتوں کی مجوزہ پیش کش کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے یہ کہیں زیادہ اچھا ہے کہ بجائے اس کے کہ انگلستان ایک مرتب شدہ معاہدہ پیش کرے اور ہندوستان کو اس پر دستخط کرنے کی دعوت دے ان معاہدوں کے مطالب کے متعلق تجاویز نئی ہندوستانی حکومت ہی کی طرف سے جب اس کی تشکیل عمل میں آجائے پیش ہوں۔ ملک معظم کی حکومت یا حکومت ہند یہ بھی کر سکتی ہے کہ مثلاً ایک عام اعلان کے ذریعہ اپنی اس خواہش کا اظہار کر دے کہ آئینی تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ نیز یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کتنا اچھا ہے کہ ہر صورت ابتدائی منزلوں میں ایک چھوٹی جماعت ہی اس مسئلہ کی چھان بین کرے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ حکومت اس پر تیار ہے کہ وہ ان لوگوں کے لئے ایک جگہ متعین کر دے اور ضروری عمل اور دوسری سہولتیں مہیا کر دے۔ نیز یہ کہ وہ اس طرح کی مجلس میں حصہ لینے کے لئے خود کسی کو دعوت دینا نہیں چاہتی بلکہ اس کی تجویز ہے کہ ان لوگوں کا انتخاب مراحت کردہ مختلف جماعتیں یا ادارے ایک معینہ تعداد کے اندر کر نیچے اور یہ کہ منتخب شدہ اشخاص کے لئے یہ ممکن ہونا چاہئے کہ اگر وہ چاہیں تو مزید اشخاص کی ایک مختصر تعداد کا احاطہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں یہ زائد اشخاص ایسے ہوں جن کا کسی خاص

جماعت یا پارٹی سے تعلق نہ ہو بلکہ اس آزاد مسلک کے ہوں جو پارلیمنٹ کی غیر جانبدار
 نشستوں کی طرف منسوب ہے۔ اس اعلان میں یہ بھی تجویز کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب
 تبادلہ خیال بنی طور پر ہوا اور بالکل باز دارانہ خیال کیا جائے۔ البتہ اگر مناسب خیال
 کیا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ کارروائیوں کی عارضی رپورٹیں مل جائیں۔ یہ
 بھی اپنی جگہ واضح ہو گا کہ سارے کے سارے آئینی مسئلہ پر تبادلہ خیال ہو سکے گا
 اور اس مجلس کا کوئی فرد محض بحث و مباحثہ میں حصہ لینے ہی سے اپنے کو یا اپنی
 جماعت کو کسی خاص پالیسی کا پابند نہ کرے گا۔ اس تبادلہ خیالی کا مقصد محض چھان
 بین ہو گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ تمام مسئلوں میں کس حد تک اتفاق ہے اور یہ
 بھی (جو کچھ کم اہم نہیں) کہ کہاں راہوں میں اختلاف ہے۔ اگر حکومت برطانیہ کے
 طور پر مزید امداد طلب کی گئی تو یقیناً وہ بخوشی دے گی لیکن یہ اچھی طرح واضح
 ہو گا کہ وہ بغیر طلب کئے کسی قسم کی عہد یا رائے نہ دے گی۔

یہ امکان بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ خواہ تبادلہ خیال کی اس نوعیت
 پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیا جائے کہ اس کی غرض محض چھان بین کرنا ہے اور یہ کہ
 کسی خاص پارٹی یا جماعت کی پالیسی پر اس کا کوئی اثر مطلق نہیں پڑتا۔ پھر بھی
 زیادہ بڑی پارٹیوں یا جماعتوں میں سے ایک نہ ایک اس تبادلہ خیال میں
 حصہ لینے پر رضا مند نہ ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بات یقیناً بڑی افسوسناک ہوگی
 لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں کہ جو مصرعے لوگ اگر آتا چاہیں تو محض اسی وجہ سے
 شرکت نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ خود انکار کرنے والی پارٹیاں یا جماعتیں بھی بعد میں
 شریک ہوئے پر تیار ہو جائیں۔ یہ بھی پیش نظر ہے کہ شاید دو جماعتیں تبادلہ
 خیال کے لئے جمع ہوں اور ہر ایک اپنی اسکیم کے پیش کرنے میں لگا رہے۔ اس
 کے مقابلہ میں دوسری طرف شاید ابتدا ہی میں یہ بات خود حکومت برطانیہ کی

طرف سے واضح کر دی جائے کہ گو حکومت خود اس باسٹیں اپنی کوئی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتی اور اس کے متعلق یہ سمجھا بھی نہ جائے کہ وہ اس پالیسی یا اس پالیسی کی حامی ہے تاہم اسے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک جماعت جو آئینی مسائل پر تبادلہ خیال کر رہی ہے وہ ہندوستان کے تقسیم یا متحد ہونے کے امکان پر کیوں بحث نہیں کر سکتی۔ نیز یہ کہ جب ساری ایکم کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگ جو اس کے اہل ہیں آئینی مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کر کے اسے صحیح طور پر سمجھ سکیں تو اس قسم کے تبادلہ خیال کو لازمی طور پر خارج از بحث نہ سمجھ لیتا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر آئین بنانے والوں کی یہ مختصر سی جماعت کسی کم بیش متفقہ نتیجہ پر پہنچی تو اس آئین کے مسودہ کو کسی ایسی زیادہ بڑی جماعت کے سامنے پیش کرنا ہوگا جیسے زیادہ قریبی نمائندگی حاصل ہو اور جو اس کتاب کی ابتدائی فصل میں تجویز کی گئی ہے۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے اور اس پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔

بہر حال یہ ابتدا ہی میں واضح کر دیا جائے کہ اسی قسم کی کوئی چیز پیش نظر ہے۔ نیز یہ کہ جس مختصر جماعت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ابتدائی کام ہی کئے ہوگی۔ لیکن اگر وہ جماعت اپنا کام بحسن و خوبی انجام دے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بڑی جماعت کی نظر ثانی محض ضابطہ کی پابندی سے زیادہ کچھ نہ ہو۔

”اعمال نامہ“

سر سید رضا علی ایم ایل اے کی خود نوشتیں و نوحیتا

ہندستان کے ہر ادبی ادارے کے ترجمان نے اس کتاب کو ۱۹۴۴ء کی بہترین تصنیف مانا ہے، اس میں نہ صرف سر سید رضا علی نے اپنے حالات لکھے ہیں بلکہ یہ ہندستان کی سو سالہ تاریخ کہی جاسکتی ہے۔ سیاست، شعور، شاعری، اخلاقیات، تنقید، معلومات، غرض کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا گیا جس پر سر سید رضا علی نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ زبان و بیان کی مثال موجودہ دور میں ہرگز ہرگز کہیں نہیں مل سکتی یہ صرف سوانح حیات نہیں ہے بلکہ اب سے سو سال کی ہندوستانی زندگی کی بے نقاب تصویر ہے۔ جس کے پڑھنے کے بعد کوئی بھی کتاب نظر دل اور دماغ کے لئے نیا پیام نہیں دیتی۔

قیمت مجلد آٹھ روپے

”بنگارستان کتبسی اردو بازار دہلی“

